

عقبة

(104)

صاحبة زيادة
مقصود الرسول

عمر رفته

صاحبزادہ محمد مقصود الرسول

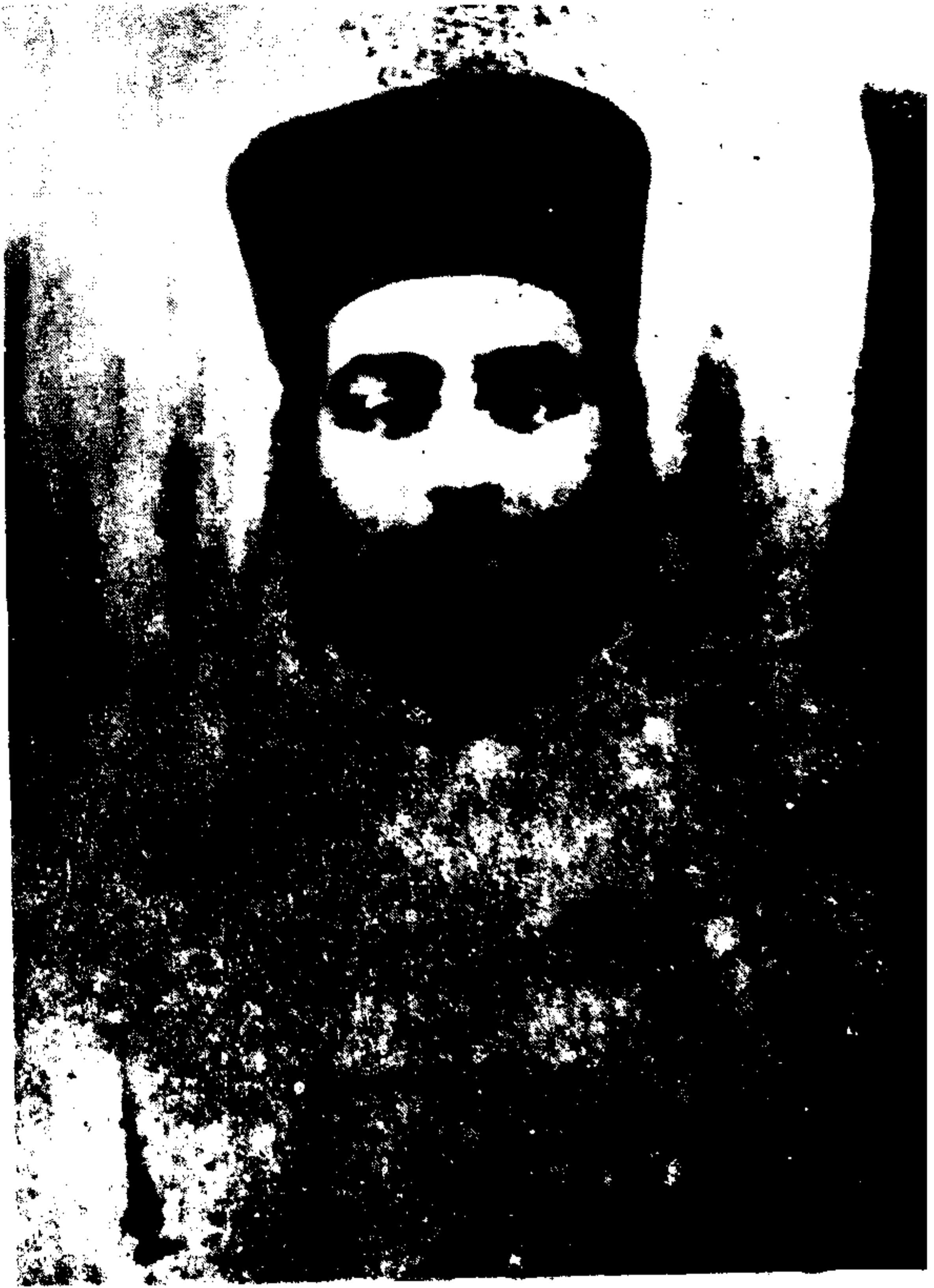


ناشر

دارالعلوم مقبولیہ للہ شریف ضلع جہلم

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

ناہ کتاب :	عمیرتہ
مصنف :	صاحبزادہ مقصود الرسول
باہتمام :	محمد مسعود چوہدری
کتابت :	محمد انور چوہدری
قیمت :	۱۰۰/- روپے
مطبع :	
ایڈیشن :	پہلا
تعداد :	ایک ہزار
ناشر :	دارالعلوم مقبولیہ للہ شریف ضلع جہلم



رابع حضرت صاحبزاده محمد مقبول الرسول رحمة اللہ علیہ

اِنشَابُ

اپنے بزرگ
 اور محترم والدین
 اور اپنے اعزاء و اقارب
 کے نام

فہرست

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۱۹	نمودِ صبح	۱-
۲۵	انقلابِ مسکن اور مکتب سے تعارف	۲-
۳۳	اینکلوور نیکیولر ہڈل سکول اللہ	۳-
۳۹	نہ شکستہ ام سبورا	۴-
۴۴	رتہ شریف	۵-
۵۲	درس نظامی	۶-
۶۴	شیش محل	۷-
۶۷	لطفِ دعائے سحر	۸-
۷۴	ایامِ تحریک آزادی	۹-
۸۶	ورنیکیولر فائنل کا امتحان	۱۰-
۹۴	گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب — سردھی	۱۱-
۱۰۴	اعلیٰ حضرت للہی قدس سرہ العزیزہ	۱۲-
۱۱۲	اور آزادی میں بجز بیکراں ہے زندگی	۱۳-
۱۱۹	دگر فائنلے راز آید کہ تاہد	۱۴-

بیش لفظ

یادِ ماضیِ غلاب ہے یا تسکینِ قلب اور ذہنی آسودگی کا ایک ذریعہ میری فیصلہ
میں نہیں کر سکا۔ بعض مقدر، مستیوں نے البتہ اس کا ذکر بڑی تسرت آفریں اور

یاں انگیز صورت میں کیا ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا ہے

کچھ بتاؤں سیدھی سادی زندگی کا ماہرا

داغ جس پر غازہ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصویرِ پھروہ صبح و شام تو

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردِ ششِ ایام تو

بلکہ یہاں تک کہہ گئے کہ: ع

میری تمام سرگزشت کھوٹے ہوٹل کی جستجو

ماضی سے لگاؤ ایک نکتہ نگاہ کے مطابق تفسیحِ اوقات کا دوسرا نام بھی ہے

ان کا خیال ہے کہ ع ماضی و مستقبل ایک نقشِ خیالِ خام ہے، یہ شاید اس لئے کہے

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر

جو مستقبل کبھی ہو گا درخشاں ہم نہیں ہونگے

چنانچہ دُنیا نے تخیل میں جہاں آباد کئے رکھنے کی مویا شہی، کسی صاحبِ ہوش

انسان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ماضی

کا حُسن اپنے اندر ایسی کشش اور ایسا جادو رکھتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی انسان

اس کے سحر سے مسحور چلا آ رہا ہے۔ جواں مرگ اختر شیرانی نے کہا تھا ۵

کوئی صورت تو ہو دُنیا نے فانی میں بہلنے کی

ٹھہر جا اے جوانی ماتم عمر رواں کر لوں

اور جناب مومن خان مومن سے زیادہ پُر تاثر انداز تو شاید ہی کسی کو نصیب

ہوا ہوسے

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، ہمیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ زمانہ تھا جو گزر گیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد نہ

ماضی سے دل بہلانے کا شغل، تو ایک عام سی بات ہے لیکن ایک روز

بیٹھے بیٹھے چند واقعات کی یاد ایسے آئی کہ آتی ہی چلی گئی۔ اس میں بعض ایسی پیاری اور

پُر کیف ہستیاں بھی تھیں جن کا ہمدان کے بغیر بے رس اور بے کیف تھا۔ لیکن بھلا

ہو کاروانِ ہستی، کی اس تیز گامی، کا کہ وہ آج مکمل طور پر نسیا نسیا ہو چکیں۔ زمانہ کی

اس رواروی، پر مجھے زبردست وحشت ہوئی اور اس خوف سے کہ مائیز روز سے

ہم چنیں، آنکھوں میں نمی کا احساس ہونے لگا لیکن بقول ملا ۵

اسے آنسو نہ کہہا کہ یاد ایام گزشتہ ہے

میری عمر رواں کو عمر رفتہ کا سلام آیا

میں نے عزم کر لیا کہ اپنی علمی کم مانگی کے باوصف ان مبارک لمحات اور ان پر بہار

شخصیات کو کسی نہ کسی شکل میں محفوظ کرنے کی کوشش کروں گا۔ ابتداء تو میں تے کر دی

لیکن آہستہ آہستہ احساس یہ ہوا کہ اس مقصد کے لئے جس فراغت و یکسوئی اور جس

ماحول کی ضرورت ہے مجھے وہ میسر نہیں۔ چنانچہ کئی کئی سال تک ایک حرف کا اضافہ

بھی نہ کر سکا۔ مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ جو کچھ حیطہ تحریر میں آچکا ہے اُسے ”جلد اول“ کے

طور پر محفوظ کر لیا جائے۔ اگر زیت ذوالجلال والا کرام کو منظور ہوا اور زندگی نے بہت

دی تو دوسری جلد بھی مکمل ہو جائے گی۔

عزیز لکھنوی کا یہ شعر ہے

غزل اُس نے چھیری مجھے ساز دینا

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

کئی باقاعدہ دیوانوں سے زیادہ وزنی اور دلآویزی ہے۔ میں نے اپنی یادداشتوں

کے لئے اسی شعر سے خوش چینی کی اور انہیں ”عمر رفتہ“ کے نام سے موسوم کر دیا۔

صاحبزادہ محمد مقصود الزسول

۵۶۳ - عمر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن

مورخہ: ۱۴ ستمبر ۱۹۸۹ء

لاہور

للہ شریف

ط لبوں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔

میں ایک طویل عرصہ اس مملکتِ خداداد کے شہروں، دیہاتوں، محلوں اور
 لگیوں میں مدتوں گھومتا رہا۔ میں نے ان گنہگار آنکھوں سے وہ دلروز مناظر دیکھے
 ہیں جن کے تصور سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ میں نے آشنا چہروں کو اس طرح دفعتاً
 بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔ جسے کبھی وہ صفِ دوستاں میں شامل نہ تھے۔ میں نے
 محبتوں کے شہر کو نفرتوں اور حقارتوں میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔ میں نے انسان
 کے سینے میں دل کی بجائے پتھر دیکھے ہیں۔ میں نے بلند پہاڑوں کو اپنی جگہ سے سرکتے
 ہوئے دیکھا ہے۔

میں تہذیبوں کے ارتقاء اور پھر انسان کے عروج و زوال کی داستان سے
 بڑی حد تک آگاہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آقائے دو جہاں، سرورِ کائنات، محبوبِ خدا،
 پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت نے کب ”رسمِ ودہِ خانقہی“ چھوڑی اور
 کب کبھی نہ ختم ہونے والی تاریکیوں کی خوفناک زنجیروں میں جکڑی گئی۔ ہم وہ تھے جن کے
 آباؤ اجداد کے قدموں سے اُٹھنے والی خاک، اپنے بے مثال جوہر سے سجھے چراغوں

کو روشنی عطا کر دیتی تھی اور وہی ہم ہیں کہ اندھی غاریں کسی خوشخوار بھٹیڑے کی طرح بڑے پھاڑے ہمارے انتظار میں ہیں۔

یہ آنکھوں کو چندھیادینے والی روشنیوں کا سیلاب اور جگمگ کرتے ہوئے بارونی شہروں میں بسنے والی قراواں مخلوق کدھر جا رہی ہے۔ انہیں راستہ کیسے ملے گا۔ ان کے دلوں میں تہہ در تہہ اندھیرے دبے ہوئے ہیں۔ جب انسان کا اندر سیاہ اور تاریک ہوتا ہے تو باہر کی مصنوعی روشنی کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

”کاغذی پیرمن“ میں مقید ہونے کے باوجود میری روح میں نامعلوم اُمید کی ایک کرن موجود تھی۔ اس نیلے آسمان کے نیچے آسمانوں سے بھی اُونچے اور بلند لوگ موجود ہیں جن کو پوچھ کر زمانہ اپنی منزلیں متعین کرتا ہے۔ یہ عالی مرتبہ بندہ گ جب قدم اٹھاتے ہیں تو درختوں کی شاخیں جھک کر سلامی پیش کرتی ہیں۔ جب وہ اپنے متبرک دامن کو جھٹکا دیتے ہیں تو شہنشاہوں کی قبائیں اپنی نامعقولیت پر شرمندہ ہو جاتی ہیں۔ یہ اُونچے اور بلند لوگ کہاں ہیں؟

حاجیزادہ مقصود الرُّسول صاحب کی زیرِ مطبوعہ کتاب ”عمرِ رفتہ“ کا مسودہ میرے مطالعے میں نہ آتا تو شاید میری معلومات میں بڑی حد تک کمی رہ جاتی۔ اُدھر ”مفتی“ نے عمرِ رفتہ کو آواز دی اور اُدھر وہ تمام تر خیالات اُٹھ کر گہرے بادلوں کی طرح میرے ذہن پر چھا گئے جن کا میں اُوپر ذکر کر آیا ہوں۔

حاجیزادہ مقصود الرُّسول صاحب سے پہلی مختصر ملاقات کے بعد میرا اندازہ تھا کہ انہوں نے اپنے پیشہ وارانہ تجربات کو یادداشتوں کی صورت میں یکجا کر دیا ہوگا۔ وہ ایک ایسے اداسے سے متعلق ہیں جہاں آٹے دن عجیب و غریب واقعات سے

دو چار ہونا پڑتا ہے اس اعتبار سے میرا کام بڑا آسان تھا کہ میں کچھ دیر کے لئے شریکِ سفر ہو کر، اُن تجربات سے لطف اندوز ہو جاتا۔ مگر ”عمرِ رفتہ“ ایک سرکاری افسر کے معمولات نہیں ہیں بلکہ یہ تو آئیٹنے کی کرسیاں لے کر دل و دماغ میں اترنے والی باتیں ہیں۔ یہ تو داستان ہے اہلِ کرم کی، صاحبِ وجاہت و حشمت کی اور اُس ذی وقار شخصیت کے ماحول کی جو حدود و کون و مکان سے آگے نکل چکا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ دُنیا ایک سرائے ہے۔ یہاں لوگ آتے ہیں۔ کچھ دیر پڑاؤ ڈالتے ہیں اور کسی سُلگتی ہوئی رات کو خیمے کی طنابیں توڑ کر گنہرتے ہوئے ٹھنڈے لمحوں کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ صاحبِ طریقت و فضیلت اس ظمراق اور شان سے ”سرائے“ میں آتے ہیں کہ روشنی کا سینارین کر کھڑے ہو جاتے۔ بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ وہ اس دُنیا کی ناپائیدار مخلوق سے قطعاً مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ مختلف اس طرح کہ وہ اس آلودہ دُنیا میں بہتے ہوئے بھی ماورائے دُنیا ہوتے ہیں۔ یہ غالب کے ”پری چہرہ“ لوگ ہیں۔ یہ اقبال کے ”مردِ مومن“ ہیں اور ”عمرِ رفتہ“ کو پڑھنے کے بعد صاحبزادہ مقصود الہ رسول صاحب کے والدِ گرامی، حاکم مملکت بلکہ شریف ہیں۔

میں نے دانتا حرفِ مدعا کا آغاز اللہ شریف سے کیا ہے۔ میں قریہ قریہ اور نگرہ نگرہ کی مسافر، اسی علاقے کا پروردہ ہوں اور انہیں ہواؤں میں سانس لیتا رہا ہوں جہاں بلکہ شریف کا ”خطۂ امن“ موجود ہے۔ پتہ نہیں کہ مجھ سے کونسی خطا سرزد ہوئی جو آج تک ”خطۂ امن“ کے ارد گرد گھومتا رہا لیکن وہاں کے لازوال تقدس سے فیضیاب نہ ہو سکا۔ مگر ”عمرِ رفتہ“ کی مضبوط گرفت نے میری بے بہا

خواہش کی تکمیل کر دی اور میں اب تک اپنے وجود سے نکل کر اللہ شریف میں
موجود ہوں جسے میں خطہ امن کہہ رہا ہوں۔ اسلام بنیادی طور پر سلامتی کا دین
ہے اور مجھے اللہ شریف کی حدود میں سلامتی کے سارے لوازمات نظر آئے۔

عمر رفتہ — ایک زبردست سفر کی پہلی منزل ہے۔ یعنی جلد اول۔
حیران کن بات ہے کہ صاحبزادہ مقصود الرسول صاحب کی قوت مشاہدہ
اس قدر شدید ہے کہ انہوں نے نہایت کم عمری میں بزرگان دین کے اطوار
کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا اور ایک ایک لمحے کو لوح فکر پر نقش کرتے چلے گئے۔
اپنے والدین سے عقیدت کا اتنا بڑا منظر ا بھیجی تک میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ والدین
کا مرتبہ اور مقام تو ہر مسلمان پر ظاہر ہے مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ
عمر رفتہ کے مصنف نے محبت و احترام کی ایسی مشعل روشن کی ہے جو آنے والی نسلوں
اور ان کے بعد آنے والی نسلوں کو بھٹکنے سے محفوظ رکھے گی۔

میرزا غالب نے جب یہ کہا تھا کہ ”آگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے“
تو یہ سارا پیرا یہ اظہار الفاظ کی کوتاہی معنی سے تعبیر تھا۔ کچھ ہستیاں اتنی بڑی ہوتی
ہیں کہ الفاظ اپنے کم وسیع ہونے کا کلمہ کرتے ہیں۔ یہی عالم ”سربراہ اللہ شریف“
کی جہانگیر صفت شخصیت کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ ایسے مقام پر جلوہ فگن تھے کہ
”کم نظراں“ کو وہاں تک رسائی کیسے ہو۔

صاحبزادہ مقصود الرسول صاحب نے اپنے بلند مرتبہ والد کے علاوہ
اپنے دیگر رشتہ داروں، عزیزوں اور خاصان محفل کا جس خوبصورت انداز سے
ذکر کیا ہے وہ اپنی جگہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ سعادت مندی کا یہ عالم ہے کہ

اللہ شریف کے معمولی مکین کو بھی بے حد غلو میں سے یاد کیا ہے۔ ”عمر رفتہ میں مصنف کے نانا محترم کے حدودِ حال اور مجلسی زندگی کے آداب اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ ایک چمن کھل اٹھتا ہے۔

میں نے عمر رفتہ کے مطالعہ سے محسوس کیا ہے کہ مصنف کو اردو، فارسی، عربی اور پنجابی پر کمال حاصل ہے۔ خاص طور پر فارسی اشعار کا استعمال اس قدر بہتہ اور بر محل ہے کہ داد دینے بغیر چارہ کار نہیں رہتا۔ اُن کے اسلوب سے ہر شعر اپنے پورے معنوی دروازے کھول دیتا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف کو اپنے قلم پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ وہ لفظوں کی قیمت سے آشنا ہیں۔ شان و شکوہ کے مواقع پر انہوں نے وہی زبان استعمال کی ہے جو مرتبے کے مطابق تھی۔ اپنی کم عمری کے باوجود، مصنف نے اُن تمام واقعات کا پُر زور اور پُر اثر احاطہ کیا ہے جن سے شخصیت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ عمر رفتہ میں اللہ شریف کا نقشہ ایسے اُبھرتا ہے جیسے یہ ایک مثالی ریاست ہو۔ اس ریاست میں کوئی بد عنوانی نہیں، کوئی بدویانتی نہیں اور یہاں کوئی بھوکا پیاسا نہیں ہے۔ اسی بات سے عیاں ہوتا ہے کہ اس مثالی ریاست کا نگران تڑپتی ہوئی انسانیت کی فلاح کے لئے کیا سوچ رہا ہوگا۔

صاحبزادہ مقصود الرئسول صاحب نے اپنے معزز، قابل احترام اور شفیق و مہربان والد کے آخری لمحات کا ذکر اس پُر سوز طریقے سے کیا ہے کہ اہل دل پر ایک رقت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک بہت بڑا آدمی اس دُنیا سے رخصت ہو رہا تھا۔ مگر واضح اعلان کے باوجود دل میں دھڑکن تھی اور پہرے سے روشنی

پھوٹ رہی تھی۔ اگلی دُنیا کا مسافر جانتا تھا ہے

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤنگا

میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤنگا

دل کا دھڑکنا اور پھول کی پتیوں کا کانپنا، اس بات کی دلالت ہے کہ ایسے

لوگ اپنے چھپے رشد و ہدایت کا ایک بہت بڑا خزانہ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ خزانہ

آنے والے دور کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہ سفرِ آخرت دراصل روشنی کا سفر ہے۔

روشنی کی صرف یہی فطرت ہے کہ وہ شہروں، دیہاتوں، گلیوں اور دلوں کو روشن

رکھے۔ صاحبزادہ مقصود الرسول صاحب نے اس روشنی کو عمرِ رفتہ میں سما دیا ہے

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فیاض اور سخی لوگ ہر رنگ میں اپنا پسندیدہ رنگ

تلاش کر لیتے ہیں۔ پُرانے فلمی گیتوں میں تصوف کا پہلو جا کر کرنا ایک عمدہ مثال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پُرانے گیت دراصل حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے

اخذ کئے گئے تھے۔ ان گیتوں میں یہ رنگ بہت عرصہ تک موجود رہا۔ یہی وجہ ہے

کہ وہ گیت آج بھی زندہ ہیں جن کا رشتہ اُس درگاہ سے ملتا ہے۔ اس بات کو

عمرِ رفتہ کے مصنف نے بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔

جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی ریاست پاکستان اُس کے بانی کا تذکرہ ظاہر کرتا

جسکہ ہمارے ہندگ کیا سوچ رہے تھے اور یہ کہ وہ سچائی کو کس طرح عام کر رہے

تھے۔

صاحبزادہ مقصود الرسول صاحب نے اپنے اساتذہ کرام کا احوال اس خوبی

اور خلوص سے لکھا ہے کہ آج کے مُعَلِّم اور شاگرد کو سبق سیکھنا چاہیے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ عمر رفتہ کی پہلی جلد ہے۔ ابھی میری تشنگی باقی ہے
اور ورق تمام ہوا۔ دُعا یہ ہے کہ قارئین کرام اس کتاب میں وہ باتیں بھی پڑھ
لیں جو بین السطور اپنا مطلب ادا کر رہی ہیں۔

عبدالقادر حسن

۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء

نمودِ صحیح

اعلیٰ حضرت لیلیٰ قدس بئزہ العزیز کے بیاض مبارک میں میری تاریخ پیدائش ہر آنکھ
 ۱۹۳۲ء درج ہے۔ ہجری تقویم کے مطابق یہ ۱۳۵۱ ہجری ہوگی۔ ابھی کچھ لوگ باقی تھے جہاں
 میں۔ چنانچہ اکثر صاحب علم لوگ ہمارے خاندان میں ولادت کے موقع پر مبارکباد کو منظوم
 شکل میں پیش کرتے اور نظم کے مقطع سے تاریخ پیدائش نکالتے۔ میری تاریخ پیدائش مولانا
 عبدالرسول صاحب بکھروی نے آخری شعر کے آخری مصرع میں سے نکالی:

گرفتہ پا ولی تاریخ گفتم روئے مقصود شد ماہ سعادت
 پوری نظم یوں ہے۔

چو مقبول رسول اہل نیابت شرہ تخت ولایت ہم سیادت
 بئشتر شد بہ پسر نیک اختر کہ بادا عمر او اندر زیادت
 گرامی اسم مقصود الرسول است (شدہ مسرور ہر کس فوق عادت
 بعد آمدز محبوب امر تاریخ برنجورٹی او بعد از عیادت
 گرفتہ پا ولی تاریخ گفتم روئے مقصود شدہ ماہ سعادت

ایسی نظیں غالباً عقیدت مند محض اظہار عقیدت کے طور پر لکھتے ہیں اور پھر انہیں
 اپنے مرشد کی خدمت میں ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے پیش کر دیتے۔ اس ضمن
 میں ویسے تو ہر گوشش نہایت قابل قدر اور قابل ستائش ہوگی۔ لیکن جو بات اس نظم

میں تھی۔ جو مولانا سلام اللہ صاحب شائق ساکن چک عمر ضلع گجرات نے میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش پر قلمبند کی۔ مجھے کسی دوسری کوشش میں نظر نہ آئی۔ اشعار میں بے ساختگی الفاظ میں برہستگی اور دیگر شعری محاسن اس میں ایسے یکجا ہو گئے کہ اس کی تعریف سے کم سے کم میرا قلم قاصر ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیفیت صرف میرے ہی لئے مخصوص ہے یا کوئی اور بھی اس میں شریک ہے۔ بہر حال اس کے پڑھنے سے وارداتِ قلب میں ایک عجیب قسم کا تغیر رونما ہونے کے بعد دلِ ناصبور متاعِ گم گشتہ کی تلاش میں زبردست احساسِ محرومی سے دوچار ہو جاتا ہے اور بالآخر ماضی کی پُر فیض اور سکون بخش یادوں کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور۔ میں تبرکاً اس پوری نظم کو درج ذیل کر رہا ہوں۔

شکرِ اللہ آنکہ در اللہ شریف	و از عطیاتِ خدائے ذوالمنن
کلفتِ بادِ خزاں گردید دُور	سبزہ از بادِ بہاری شد چمن
در شبستانِ جنابِ عبدالرسولؐ	شد فروزاں شمعِ کافوری لگن
بار آور گشت نخلِ نقشبند	یا رسید این نافہ از مُشکِ ختن
قمریان و عندیسانِ ہزار	تہنیتِ گویاں باوازِ حسن
زرگس اندر باغِ مشتاقِ جمال	تا بہ بنیند روئے پاکِ گلِ بدن
دستِ خود افراشتہ ہر دم چنار	از پئے دعواتِ آلِ غنچہ دھن
نیرِ اقبالِ اوتاباں بود	تا قیامت در سلامت از فتن
پرورشِ یابد بصدِ اعزاز و ناز	در قماطِ عصمت از رنج و محن
شائق از فرمائشِ یارانِ خویش	چوں مقید شد چوں بُر اندرسن
بے سر اندیشہ سالِ زادنش	گفت "شمعِ خاندانِ قطبِ زمن"

یہ پوری نظم والد محترم نے میری "نعتوں والی کاپی" منگوا کر میری موجودگی میں اپنے دست مبارک سے رقم فرمائی۔ اُس روز بڑے خوش خوش تھے اور نہایت خندہ روئی اور متبسم چہرہ سے سارے اشعار لکھتے رہے۔ افسوس کہ تاریخِ تحریر درج نہیں اور نہ اُس وقت اس صفحہ کے متبرک اور تاریخی اہمیت کے حامل ہونے کا کوئی احساس تھا تاہم گمان غالب یہ ہے کہ یہ ۱۹۴۵ء کی گرمیوں کی کوئی دوپہر تھی۔ گھر کے درمیانے کمرہ میں انہوں نے کرسی پر بیٹھ کر کھانا تناول فرمایا اور نہایت ہلکے پھلکے موڑ میں یہ جنس گراں ہمیشہ کے لئے مجھے عطا فرمادی۔

بچپن کی قدیم ترین یاد جو میرے ذہن کے دور دراز نہاں خانوں میں ابھی تک محفوظ چلی آ رہی ہے۔ وہ دادی جی بی کریم بی صاحبہ مرحومہ مغفورہ کا وہ شمالی کمرہ ہے جو پُرانے گھر میں تھا اور جہاں میں ان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ میں دراصل بلحاظ تقسیم ان کا "بیٹا" تھا اور وہ مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ درسِ قرآن مجید بھی دیتے تھے۔ اور اپنی شاگرد بچیوں کو خوب ڈانٹتے لیکن ان کا پُر خلوص دستِ شفقت ڈانٹ ڈپٹ کی تلخیوں کو حلاوت اور شیرینی میں تبدیل کر دیتا وہ مجھے کھانا اپنے پاس بٹھا کر کھلاتے اور میرے حقوق کے لئے دوسرے اہل خانہ سے جھگڑا بھی کر لیتے۔ یہ غالباً ۱۹۳۶-۳۷ء کی بات ہوگی چائے اُس زمانہ میں ایک اجنبی قسم کا مشروب متصوّر ہوتا۔ لیکن وہ چائے کے بڑے رسیا تھے اور اس کے لوازمات میں تقریباً خود کفیل دوہ بکری کا استعمال کرتے۔ جس کی نگہداشت اکثر اوقات وہ خود کرتے۔ میری اولین یادداشت کے مطابق انہوں نے ایک بھورے رنگ کی بُربالی، بکری پال رکھی تھی جس کا وہ بڑا خیال رکھتے اور گھر منگوا کر اس کی مزید خاطر مدارات کرتے۔ ایک مرتبہ

برادر عزیز صبغتہ اللہ صاحب نے اسے روٹی کے خشک ٹکڑے کھلا دیئے اور وہ مر گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس بکری کی اچانک موت میرے دل کی شفاف سیٹ پر باقاعدہ ایک نقش چھوڑ گئی۔ ”اٹریفل زمانی“ کا لفظ میں نے انہی کی زبان سے سنا۔ سیاہی مائل کوئی معجون نما چیز تھی۔ اسے نہایت پرانے ڈبوں میں محفوظ رکھتے۔ اور رات کو سونے سے قبل کبھی کبھی استعمال فرماتے۔ ستم ظریفی یہ کہ بعض اوقات اس پروگرام میں مجھے بھی شامل کر لیتے اور میں نہایت بے دل سے اسے سزا کے طور پر قبول کر لیتا۔ بڑی پھسکی اور بزدانہ قسم کی کوئی چیز ہوتی تھی۔

یہی وہ زمانہ ہے۔ جب والد محترم اپنی مروانہ نشست گاہ یعنی ”بنگلہ“ اور شش محل سے شمالی گھر کے طویل صحن سے ہوتے ہوئے مغربی کورنر پر پہنچ کر جنوبی گھر میں داخل ہوتے اور پھر دالان سے گزر کر ایک بالکل مختصر لیکن نہایت روشن اور ہوادار کمرہ میں آکر بیٹھ جاتے۔ بعد میں یہی کمرہ برادر محترم صاحبزادہ عبدالرسول صاحب کے لئے ایک عرصہ تک مختص رہا۔ یہ اُن کے دوپہر کے کھانے کا معمول تھا۔ وہ جب آتے تو ان کی آمدانی پر شکوہ ہوتی کہ سارے ماحول اور درو دیوار پر گویا ایک لرزہ طاری ہو جاتا۔ ہر فرد و بشر نگاہیں جھکا کر ادب و احترام کی تصویر بن جاتا۔ وہ خود اس طرح چلتے کہ نکاہیں قدموں پر مرکوز ہوتیں۔ وہ دائیں بائیں دیکھنے کے بالکل عادی نہ تھے۔ ایسا لگتا کہ کوئی فوق البشر رب ذوالجلال کے اذن خاص سے چلتا ہوا آگے آ رہا ہے۔

اس گھر کا صحن مکمل طور پر کمروں سے محدود لیکن کشادہ تھا۔ صحن کے درمیان میں تقریباً بارہ بارہ فٹ کے طول و عرض کا ایک بڑا روشن دان (مگھ) تھا۔ جس سے روشنی پھیل منزل میں پہنچتی۔ یہ ”گراؤنڈ فلور“ تقریباً غیر آباد تھا اور اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود

ایک سٹور کے طور پر مستعمل۔ البتہ ایک معمر ترین درویش ”بابا خان“ کی رہائش مجھے اس میں یاد ہے۔ مولانا فضل دین از دکلید، (علاقہ نسون) (ضلع نوشاب) المعروف ”مولوی ڈورہ صاحب“ جو نہایت با شریع اور پرانی وضع کے عالم با عمل تھے۔ اسی ’مگھ‘ سے جمعہ کے روز بوقت چاشت مستورات کے لئے ’مٹلے‘ بیان کرتے۔ قصبہ کی خواتین کافی تعداد میں یہ ’مٹلے‘ ’مٹلے‘ کے لئے جمع ہوتیں اور جمعہ کا دن ایک پُر لطف گہما گہمی اور رونق میں گزرتا۔ مولانا فضل دین (رحمۃ اللہ علیہ) والد محترم اور چچا جان کے اُستاد بھی تھے اور اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کے کُتب خانہ کے انچارج بھی۔ پرانی مسجد (مسجد پختہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز) کے شمال مشرقی کونہ میں یہ اتہائی نادر قلمی نسخے اور بیش بہا دینی کتابیں ان کی تحویل میں ہوتیں۔ والد محترم اکثر نماز سے فارغ ہو کر ان سے نہایت پیار اور پورے احترام کے ساتھ فارسی میں گفتگو کرتے مولانا بعد میں ہمیں بھی ابتدائی تعلیم دیتے رہے۔ وہ ”گراں گوش“ تھے۔ لہذا ان سے تعلیم و تعلم خاصا مسئلہ تھا۔ ماہم جناب برادر بزرگوار صاحبزادہ محمد مطلوب الرسول صاحب سجادہ نشین صاحبزادہ عبدالرسول صاحب اور مجھے ان کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

بڑے مائی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا اس گھر کے مغربی حصہ کی ایک کوٹھڑی میں رہتے۔ جہاں ان کی اجازت کے بغیر کسی کا گزر ممکن نہ تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں علم محترم جناب حضرت صاحبزادہ محمد محبوب الرسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ستمبر ۱۹۷۱ء میں انتقال ہوا۔ مائی صاحبہ ایک اتہائی قابل احترام شخصیت تھے۔ وہ ہمارے خاندان کے معمر ترین فرد ہونے کے علاوہ ثالث حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ہمیشہ بھی تھے۔ لہذا ہر کہ و مہ کے لئے یکساں طور پر واجب التعظیم۔ وہ صحیح معنوں میں ایک بادشاہ قسم کی خاتون ہونے کے

ساتھ ساتھ زہد و اتقاء کا مجسمہ بھی تھے۔ صبح صبح قصبہ کی چند نیک سیرت خواتین علیحدگی میں ان کے سامنے بیٹھ کر باقاعدہ مراقبہ کرتیں۔ ان کے حکم سے سرتابی کی کسی کو مجال نہ تھی۔ سبز چائے استعمال فرماتے اور ان کی خادما میں اسے تیار کرنے کی خاص مہارت رکھتی تھیں۔ دوپہر کا کھانا اوپر بنگلہ المعروف ”ماڑی“ میں تناول فرماتے۔ لیکن اس شان کے ساتھ کہ اُس وقت کسی کو بھی اُس طرف سے گزرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ میں البتہ اس اصول سے مستثنیٰ تھا۔ یہاں تک کہ مجھے خاص طور پر بلوا کر کھانے میں شریک کر لیتے۔ ایک دوپڑیاں جو اسی بنگلہ میں رہتی تھیں۔ ان سے خاصی بے تکلف تھیں اور باقاعدہ کھانے میں شریک ہوتیں۔ تاہم میری موجودگی ان کے لئے بڑی بد مزگی کا باعث بنتی۔ وہ جب شور مچا کر اس ”داخل در معقولات“ پر احتجاج کرتیں تو مائی صاحبہ دبی زبان میں انہیں نوحا ہوتے اور مسکراتے۔ کھانا کھلانے کی خدمت مائی فیض بی صاحبہ مرحومہ کے ذمہ تھی۔ جسے اس نیک کردار خاتون نے کمال خلوص نیت سے نبایا۔ وہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ہمارے گھر میں انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

حضرت مائی صاحبہ کا یہ معمول جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ تقریباً ۱۹۳۶ء سے

۱۹۴۱ء تک رہا۔ اس کے بعد معمولات میں تو کیا فرق آنا تھا البتہ مقامات کی تعیین مجھے

یاد نہیں۔

انقلابِ مسکن اور مکتب سے تعارف

۱۹۳۸ء کے لگ بھگ ہمارے گھر میں ایک چھوٹا سا انقلاب آیا اور وہ یہ کہ والدِ محترم اور چچا جان نے اپنے اپنے رہائشی حقے آپس میں تبدیل (EXCHANGE) کر لئے۔ اب ہم گویا اپنے رہائشی مکان کے اُس حصہ میں منتقل ہو گئے۔ جہاں پھر ایک طویل عرصہ تک قیام رہا اور زمانہ ہوش کی بیش تر قیمتی یادیں اور ناقابل فراموش واقعات اسی گھر اور ماحول سے وابستہ ہیں۔ یہ گھر نسبتاً غیر وسیع اور مختصر تھا۔ بلکہ شروع شروع میں تو صرف دور رہائشی کمروں پر مشتمل تھا۔ شمالی کمرہ میں امی جان مع اپنے افرادِ کنبہ کے رہتے اور جنوبی کمرہ جو مقابلہ تاروشن اور فراخ تھا، میں بی بی کرم بی صاحبہ معغورہ قیام پذیر۔ حضرت مائی صاحبہ اور بی بی کرم بی صاحبہ دونوں بزرگ خواتین والدہ ماجدہ سے بڑی محبت رکھتی تھیں اور ان کے دکھ درد میں باقاعدہ شریک ہوتیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس تقسیم کے نتیجہ میں افرادِ کنبہ بھی بٹ گئے اور خدام یعنی درویش صاحبان کی بھی الاٹمنٹ ہو گئی۔ حضرت مائی صاحبہ اور بی بی کرم بی صاحبہ ہمارے حصہ میں آئے جبکہ دادی جان ٹھٹھے والے اور ماجی صاحبہ جناب عم محترم کے حصہ میں۔ اسی طرح میاں محمد صاحب احمد آبادی، بدر دین مرحوم (سگھر) نظام رسول چکوڑوی، نور دین (لڈ شریف) اور فقیر از کھو کھو زبیر۔ والدِ محترم سے منسلک ہوئے تو رمضان چدھر، رمضان ڈاچی والا، منشی فضل، میاں زیادہ اور صاحب جادہ، عم محترم کے لئے مخصوص ہو گئے۔

ویسے تو یہ سب لوگ اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کے خادمانِ خاص میں سے تھے اور یقیناً ان کے منظورِ نظر بھی۔ لیکن جو بات میاں محمد صاحب احمد آبادی میں تھی، مجھے کسی اور میں نظر نہ آئی۔ وہ بڑے شب زندہ دار اور متقی انسان تھے۔ خاموش طبع اور اپنے کام سے مطلب رکھنے والے۔ چہرہ ایسا نورانی کہ

”کیف مدّ ظلّٰ نقش اولیاست کو دلیلِ نورِ خورشیدِ خداست“

کی زندہ تفسیر۔

رمضان شریف کے شبینوں میں انتہائی ضعف کے باوجود بعض اوقات بحالتِ قیام واحد سامع رہ جاتے۔

ان دنوں ہر گھر میں شبینوں کا رواج نہ تھا اور نہ ہی رمضان شریف کے علاوہ کبھی کوئی محفلِ شبینہ سُننے میں آتی۔ شبینہ، باقاعدہ نمازِ نوافل میں ہوتا اور سامعین میں سے بھی آرام کے وقفوں سے باقاعدہ نماز میں شریک ہوتے رہتے۔ میاں محمد صاحب البتہ شام سے لے کر سحر تک بغیر کسی وقفے کے کھڑے کھڑے قرآن پاک سُننے اور ہم حیرت سے ان کا منہ تکتے رہ جاتے۔ عفتوانِ شباب میں ثانی حضرت قدس سرہ العزیز سے بیعت کی اور عمر بھر کے لئے پیرخانے، ہی کے ہو کر رہ گئے۔ نہایت بہادر اور طاقتور نوجوان تھے اور بیل چلانے میں سب سے اگے ہوتے۔ آہستہ آہستہ عمر رواں چھلتی گئی۔ یہاں تک کہ ہر فرض سے سبکدوش ہو کر صرف ایک تبرک کی صورت اختیار کر گئے اور بہرہ رننگین کی یادگار ہوں میں۔ یعنی اپنا ہی سو گوار ہوں میں کی تصویر پر تاثیر انہوں نے اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کو زمانہ ہوش میں دیکھا تھا۔ کبھی کبھی اس زیارت کی تفصیل جب سناتے تو یوں کہہ دلوں میں ان کے سہیل گم یہ ہوگا۔ اگر باویدہ پر غم نہ ہونگے؛

ان کی وفات اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ہوئی انہیں جب لندن میں اتارا گیا تو نانا جان
حضرت مفتی عطا محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُوپر سے ان کا کھلا ہوا روشن چہرہ دیکھ کر
پکار اُٹھے۔ ہَذَا فَلْيُعْمَلِ الْعَامِلُونَ۔

رمضان چڑھتا ایک زندہ دل اور خوش طبع انسان تھا اور والدِ محترم کا ابتدائی
دور میں نہایت معتمد۔ نور دین پر خوری میں بدنامی کی حد تک مشہور لیکن خدمتگار اور
اپنے پیرخانہ سے والہانہ عقیدت رکھنے والا۔

بہر حال اس انقلاب سے درویش حضرات کی ذمہ داریاں اور کسی حد تک
وفاداریاں بھی متعین ہو گئیں۔ ہمارے گھروں کے رہائشی حصہ کو ایک ”گھر“ کا نام دینا ایسا
ہی تھا جیسے برقی پنکھے کے تین بلیڈوں کو مکمل دینکھا، سمجھ لیا جائے یا جلد بندی کے دو گتوں
کو پوری کتاب۔“

اس ”گھروں سے معذرت کے ساتھ“ گھر میں جن جن عملی مشکلات کا والد ماجد کو
سامنا کرنا پڑا ان کا تصور آج کے زمانہ میں ممکن نہیں اور جس صبر و تحمل سے انہوں نے یہ سب
کچھ برداشت کیا۔ یہ بھی انہی کا کمال تھا۔ غالباً ایسی ہی مشکلات کا احساس کرتے ہوئے
اس زمانے میں تقریباً گاؤں سے باہر ”شوکیاں ولے ٹوٹے“ سے متصل والدِ محترم نے
مستری فتح محمد صاحب بھلوال کی نگرانی میں ایک نہایت خوبصورت بنگلہ نما عمارت بنانے
کا پروگرام بنایا اور تھوڑی ہی مدت میں یہ عمارت تیار بھی ہو گئی۔ اس عمارت کی چھت
روایتی چھت نہ تھی بلکہ سینٹ سر یا اور اینٹ کے مرکب سے تیار کی گئی تھی۔ چنانچہ
اس علاقہ میں لوگ لینٹل کی چھت سے پہلی بار متعارف ہوئے لیکن افسوس کہ ہمارے
معمار حضرات کچھ زیادہ پختہ کار ثابت نہ ہوئے اور لینٹر، کو موسم کی دست برو سے

محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر نہ کر سکے۔ ورنہ شاید ہم بہت پہلے ہی یہاں منتقل ہو چکے ہوتے بہر حال اب یہی عمارت بفضل اللہ تعالیٰ ضروری مرمت کے بعد جناب بھائی صاحب کے زیر استعمال ہے اور آج بھی پختہ ترین عمارت سمجھی جاتی ہے۔ چونکہ لنگرہ کا سارا سلسلہ بھی رہائشی حصوں ہی سے متعلق تھا اور نئے بنگلہ میں منتقلی کی تجویز والد محترم نے اس کی چھتوں کے ”غیر پختہ“ ہونے کی بناء پر ترک کر دی تھی۔ لہذا کچھ عرصہ بعد لنگرہ والے حصہ المعروف ”تندوری“ کو مستقف کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کے مغربی حصہ پر باورچی خانہ تعمیر کر کے مشرقی حصہ کو ہم بطور صحن استعمال میں لے آئے۔ مغربی صحن کی شمالی دیوار جو پردہ کا کام دیتی تھی وہاں سے ہٹا دی گئی اور صحن کی حدود مسجد والی گلی تک وسیع ہو گئیں۔ اس ”القلاب مکانی“ ہی کے دنوں کی بات ہے کہ ایک نہایت خشکفہ اور رُوح پرور صبح کو والد محترم مجھے خالقاہ شریف میں استادا حافظ جی اللہ دتہ صاحب کے درس قرآن مجید میں داخل کرانے لے گئے۔ والد محترم کے پیچھے ایک ہجوم بصورت قافلہ دست بستہ سر جھکائے مسجد تک چلا گیا۔ میں ’بی غلام بی‘ صاحب مرحومہ از ’طل طوطا‘ ضلع راولپنڈی کے ’کنڈھاڑے‘ پر سوار ایک نئی دنیا سے متعارف ہونے چلا تھا۔ مجھے کوئی احساس نہیں تھا کہ والد محترم کا اس طرح پیدل چل کر خالقاہ شریف تک جانا کتنی عجیب اور غیر معمولی بات تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ ”پھٹی مچھانی“ کے گھر کی دیوار کے سائے میں چل رہے تھے۔ چل کیا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت انسانی شکل اختیار کرنے کے بعد ماحول کو منور کر رہی تھی۔ ایک کھاری میں مٹھالی تھی اور وہ اس سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ اتنی وافر مقدار میں میں نے حلوائی کی دکان سمیت پھر مٹھالی نہیں دیکھی۔ اس کے بعد کی تفصیل مجھے یاد نہیں کہ درس میں پہنچے تو کیا ہوا۔

پہلا حرف کس طرح ادا ہوا اور کس کے تلمذ میں۔ بہر حال اُستاد صاحب اللہ دتہ کے درس میں میں داخل ہو گیا۔

اُستاد صاحب ضعیف العمر تھے۔ لیکن اُن کا دبدبہ خوب تھا۔ نابینا تھے لیکن پھر بھی ہر شاگرد اِن کی نگاہ میں ہوتا۔ عمر کے آخری حصہ میں پہنچ جانے کے باوصف سخت گیر تھے۔ لیکن حفظِ قرآن مجید کے ضمن میں اُن کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا بخوبی کی انتہا ہوگی۔ بزرگ اتنے تھے کہ والدِ محترم کے بھی اُستاد۔ وہ کھانا جب کھاتے تو پیار کی علامت کے طور پر مجھے بھی اِس میں شریک کر لیتے۔ یہ کھانا بے حد لذیذ ہوتا بلکہ آج تک وہ لذتِ کام و دینِ مجھ سے فراموش نہیں ہو سکی۔

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ حافظِ جی مغفور کا یہ درس اُس درسِ پاک ہی کے تسلسل کا ایک نام تھا جو اللہ شریف میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز نے حضرت پیرِ قصوری دائم المحضوری قدس سرہ العزیز کی اجازت سے شروع کیا اور جو اِس وسیع تر علاقہ میں واحد درسِ قرآنِ پاک تھا۔ اِس مدرسہ سے اُن گنت لوگ حفظِ قرآنِ حکیم کی نعمت سے مالا مال ہو کر نکلے اور اِس نعمت کو مزید وسعت دینا اپنی زندگی کا مقصد و حید قرار دیا۔ میں ۱۹۶۲ء میں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں جب اُنک (کیمبلپور) پہنچا تو ایک درویش صفت بزرگ سید میرا محمد شاہ دلاں وکالت کرتے تھے۔ ایک اُدھ ملاقات ہوئی تو پوچھنے لگے۔ ”عزیز تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“ میں نے عرض کیا۔ ”بلد شریف ضلع جہلم کا“ یہ سنتے ہی وہ اچانک سنجیدہ ہو گئے اور اِسی حیرت زدگی کے عالم میں مجھے غور سے دیکھتے دیکھتے آبدیدہ ہو گئے پھر ایک لمبی آہ بھر کر فرمایا۔ ”بھلے زمانے میں دلاں درسِ قرآنِ پاک ہوا کتنا تھا اب تو یہ روایات ختم ہو چکی

ہوں گی۔ میں نے عرض کیا کہ درسِ قرآنِ حکیم اللہ شریف میں اللہ تعالیٰ کے ایک مقربِ خاص اور بالکمال بزرگ حضرت مولانا غلام نبی قدس سرہ العزیز نے شروع کیا تھا اور انہی کی زندہ کرامت کے طور پر آج تک جاری و ساری ہے۔ یہ سنتے ہی سید صاحب کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا اور پھر دیر تک وہاں سے فارغ شدہ حفاظِ کرام کا تذکرہ محبت اور عقیدت کے جذبے سے کرتے رہے۔

اُس زلزلے میں خاصے معمر لوگ بھی حفظِ قرآنِ پاک سے دلچسپی رکھتے تھے اور طلباء کی تعداد خاصی تھی۔ افسوس کہ ان سب کے نام مجھے یاد نہیں۔ البتہ ایک صاحب جو خاصے معمر تھے۔ سائیں، کے نام سے معروف تھے اور اتنے ”چہیرا لہجہ“ تھے کہ ان کی چھینک سارے درس پر سناٹا طاری کر دیتی۔ ایک نابینا حافظ الموسوم ”زیادہ“ تھے۔ بڑے سیاہ فام میری یادداشت کے مطابق ان کی تعریف اس شعر کے بغیر ممکن نہیں ہے

ماہ را از ظلمتِ دل داغ داغ

بَرِ فَرخِش، خورشیدِ محتاجِ چراغ

مسجد خاتقاہ شریف ان دنوں گاؤں سے باہر بالکل الگ تھلگ واقع تھی اور یہاں بالکل ہی ایک نئی دنیا آباد نظر آتی۔ صرف کہاروں کا محلہ اور اُس سے متصل بسین المعروف شینے، ترکھان وغیرہ کے آٹھ دس گھر اس کے پڑوس میں واقع تھے جو بذاتِ خود ایک سٹلائٹ ٹاؤن، کی حیثیت رکھتے تھے۔ مسجد کا اپنا ایک کنواں تھا اور مسجد کے حوض میں پانی پہنچانے کا انتظام نہایت معقول۔ ایک طویل نالی سر دیوار چلتی ہوئی مٹ، یعنی حوض تک پہنچتی۔ دھوکے لئے ”پتلی“ کافی لمبی تھی اور لوگ ٹوٹیوں کے پانی سے دھو کرتے۔ ایسا انتظام اُس زلزلے میں بہت ہی خال خال تھا۔ مسجد کے فراخ

اور کشادہ صحن سے ملحق اہلی اور کھجور کے درخت ماحول کو مزید تازگی اور تراوت بخشتے۔
 الحمد للہ کہ یہ نشائیاں آج تک قائم ہیں۔ ماسوائے اُس دکھجور کے جو طویل ترین تھی
 اور جس کے تنے سے ملحق ایک پرانے درویش 'سخی بابا' کی 'جھگی' ہوتی تھی۔ سخی بابا
 کھجوروں کی حفاظت اس طرح کرتے کہ ان کے گچھوں کے گرد 'توہرے' چڑھادیتے۔
 اُس زمانے میں ملحقہ زرعی زمین میں بیری کے دو پونڈ شدہ درخت بھی ہوتے تھے
 جو تقریباً ۱۹۵۶ء تک قائم رہے۔ ان کے سیاہ بڑے بڑے، موٹے اور خوش مذاقہ
 ہوتے۔ ان کی حفاظت بھی سخی بابا کی ذمہ داری تھی۔ وہ ایک بڑی لمبی رستی پرانے ٹین
 سے باندھ کر درخت سے لٹکادیتے جسے وقفے وقفے سے اپنی جھگی سے ہی اس طرح ہلاتے
 کہ اس کا 'دکھڑکار' طوطوں میں بھگڑ چکا دیتا۔ 'سخی بابا' خشک مزاج اور سخت گیر تھے
 اور برعکس نام نہند زندگی کا فورے کے مصداق انتہائی کنجوس۔ چنانچہ ایسے ماحول میں سیاہ بیری
 کھالینا ہمارے نزدیک عیاشی سے کم نہ ہوتا۔ ایک دن بعد از نماز عصر والد محترم وہاں
 تشریف لے گئے تو سخی بابا نے ڈھیر سا بے سُرخ مائل موٹے موٹے تازہ بیراز خود ان کی
 خدمت میں پیش کئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بابا جی نے یہ تحفہ بہ کمال نیاز مندی و خندہ روئی
 سے پیش کیا۔ والد محترم نے خوشی خوشی ایک دو بیر اٹھائے اور بقایا حاضرین مجلس میں
 تقسیم کر دیئے۔ یہ ان کی زندگی کا ایک عام معمول تھا۔

زگر دوں فتد آنچہ بر لالہ من

فروریزم اورا بہ برگ گیا ہے

میں حیران اس بات پر تھا کہ جو شخص اتنا دُعبوساً قمطریرا ہو وہ اتنا نیاز مند

بھی ہو سکتا ہے؛ اور بر جیسی نعمت کسی کو از خود بھی پیش کر سکتا ہے۔

میں بہر حال اب اس درسگاہ کا باقاعدہ طالب علم بن گیا۔ استاد جی نے مستری غلام جیلانی کو مجھے گھر سے مکتب تک لانے کی ذمہ داری تفویض کی تھی۔ یہ شخص میرے وہم و گمان سے کہیں زیادہ ہوشیار ثابت ہوا اور میری مسجد تک نہ جانے کی ہر کوشش اپنی تدبیر سے ناکام بنا دیتا۔

استاد جی صاحب کچھ عرصہ بیمار رہ کر انتقال فرما گئے تو ان کے نائب حافظ نواب صاحب نے مسند تدریس سنبھال لی۔ نواب صاحب نہ تو اتنے آزمودہ کار تھے اور نہ ہی بہ لحاظ احترام اتنے محترم تاہم درسگاہ کا کام چل نکلا۔ میں اب دوسرے پارہ میں پہنچ کر سبق، دست سبق، اور منزل، کی اصطلاحوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ درس میں جو مسجد کے اندر یا باہر دالان میں ایک مستطیل دائرے کی صورت میں ہوتا چند جانے پہچانے چہرے ہمیشہ اپنی مخصوص جگہوں پر براجمان جھول جھول کر قرآن پاک پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے۔ مختصراً یہ کہ خالقاہ شریف کا ماحول جو شروع شروع میں میرے نزدیک ناروا پابندیوں اور کھیل کود کے خلاف ایک سازش، سے عبارت تھا۔ اب زیادہ اجنبی نہ رہا تھا۔ وہاں کے معمولات اب زیادہ دل شکستگی کا باعث نہ بنتے، ہنسی خوشی پڑھنے جانا اور اسی طرح لوٹ آنا۔

لڈنگلوور نیگولر مڈل سکول لڈ

لیکن افسوس کہ یہ معمول زیادہ دیر پائا ثابت نہ ہوا اور ایک چمکیلی صبح کو باہر مسجد کے صحن میں سے والد محترم نے مجھے گھر بلوایا۔ معلوم ہوا کہ آئندہ پڑھنے کے لئے میں ڈرنگلوور نہیں جاؤں گا بلکہ اب مجھے سکول جانا ہوگا اس لحاظ سے تو ایک گونہ خوشی ہوئی کہ سنت سبق، اور منزل، پر طویل اور اکتا دینے والی مغز ماری سے جان چھوٹی لیکن ایک دفعہ میں شدید سو کر رہ گیا۔ مجھے یہ بالکل یاد نہیں کہ سکول تک مجھے کون لیکر گیا اور داخلہ کی رسم کس طرح ادا ہوئی۔ بہر حال اتنا یاد ہے کہ ”اینگلوور نیگولر مڈل سکول لڈ“ کی عمارت کے مغربی حصہ (WING) کے انتہائی جنوبی کمرے کے اندر میں کچی پہلی میں بیٹھ گیا۔

جب میں پہلی بار اس ماحول سے متعارف ہوا تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ سکول اور مکتب کے درمیان کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ جماعت چند سخت بدتمیز لڑکوں پر مشتمل تھی جو میرے خیال کے مطابق احترام استاد کے تصور سے یکسر محروم و نا آشنا تھے۔ کمرہ کا ماحول غلیظ تھا۔ بیٹھنے کے لئے بچھا ہوا ٹاٹ بطور سیاہی چوس استعمال میں لایا جا رہا تھا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بجائے ’اُمّ ہب‘ پٹی اور چوڑے چوڑے کا سبق پڑھا تو اپنی قسمت پر بے اختیار رونما آیا اور بڑی مایوسی کے عالم میں سوچا نظر

کہاں آگئے ہم جن سے نکل کے

ہمارے انچارج ٹیچر منشی محمد حسن صاحب البتہ نہایت پرسکون اور باحوصلہ
استاد ثابت ہوئے۔ میرے لئے غالباً ان کے دل میں والد محترم کی نسبت سے
نرم گوشہ بھی تھا۔ یہ درست ہے کہ ابتدائی مراحل میں اگر ایسا حلیم بطبع استاد میسر
نہ آتا تو شاید اس ماحول سے صلح نہ ہو سکتی اور ایک نہ ایک دن میں ”یہ مجلس نامعقولوں
کی ماحول ولا، ماحول ولا“ کا نعرہ لگا کر وہاں سے بھاگ نکلتا۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک
حقیقت تھی کہ اس ماحول سے صلح، کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ آہستہ آہستہ لکھنے پڑھنے سے
دلچسپی ہونے لگی۔ جب پہلی دفعہ میں نے اپنا نام لکھا تو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ میں
نے والد محترم کو بھی اس میں شامل کرنا چاہا تو انہوں نے خود اپنے دست مبارک
سے تختی پر میرا نام لکھا اور اس طرح میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

ہمارے ہیڈ ماسٹر راجہ محمد خان بڑی رُعب دار شخصیت کے مالک تھے۔
بشکل نوک اُوپر اُٹھی ہوئی مختصر منجھیں ان کے دبدبہ میں معتدبہ اضافہ کرتیں۔ وہ
میانے کھوہ، سے نمودار ہو کر جب بڑے درخت کے قریب پہنچتے تو تمام لڑکے
سکول کی عمارت کے چھپے چھپ کر دیک جلتے اور شور مچھم جاتا۔ وہ کم گو اور نظم و ضبط
کے بے حد پابند تھے۔ انگریزی لباس پہنتے۔ میں نے جب انہیں قریب سے دیکھا
تو ان کی شلوار، میری نگاہ میں بڑی کھٹکی۔ میں نے اپنی اس حیرانی کا ذکر ماموں جان
عبدالقدوس صاحب سے جو اتفاق سے اللہ شریف آئے ہوئے تھے کیا کہ ہمارے
ہیڈ ماسٹر صاحب کی شلوار ایک موٹے سے خوبصورت کپڑے کی ہے اور پھر پانچے
باہر کی طرف مڑے ہوئے بھی ہیں۔ انہوں نے میری اس نادانی پر بڑا ترس کھایا

اور وضاحت کی کہ وہ شلوار نہیں بلکہ پتلون ہے۔ لفظ پتلون چونکہ ابھی تک میری لغت میں شامل نہیں ہوا تھا۔ میں دم بخود ہو کر دیر تک ان کی طرف دیکھتا رہا۔

ہمارے کمرہ سے بالکل متصل میل کے بڑے درخت سے ایک چھوٹا سا گارڈرنالو لگا ہوا تھا۔ جس سے گھنٹی کا کام لیا جاتا۔ گھنٹی مقررہ وقفوں کے بعد ایک دو تین کے حساب سے بجتی اور وقت گزرنے کا احساس دلاتی رہتی۔ چھٹی کی گھنٹی البتہ مسلسل بجتی اور ہم ”جرس فریڈے دار دکہ بر بندید محمل ہا“ کا نعرہ لگاتے بے شکم قسم کا شور مچا کر وہاں سے دوڑ پڑتے۔

مڈل سکول کی یہ عمارت ایک معقول نقشہ پر اٹھائی گئی تھی اور سکول کا چار دیواری سے محدود لیکن خاصا فراخ صحن چھوٹی چھوٹی خوبصورت کھیلوں پر مشتمل تھا۔ جن میں ملک فیروز خان صاحب جو ساتویں کلاس کے انچارج تھے۔ بڑی محنت سے پھول لگاتے اور ان کی آبیاری کرتے۔ صحن کے اندر سلیقہ سے تیار کی ہوئی روشیں ان کو ایک دوسرے سے جدا کرتیں۔ ان روشوں پر لڑکے ڈرل اور تفریح کے وقت بڑی پابندی سے قطار اندر قطار اُدھر اُدھر چل کر جاتے۔ یہ سب ہیڈ ماسٹر صاحب (راجہ محمد خان) کا اعجاز تھا یہ کمال نظم و ضبط مجھے بعد میں کسی بھی تعلیمی ادارے میں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ بلکہ خود اسی سکول میں راجہ صاحب کے تبدیل ہونے کے بعد ان روشوں پر لڑکوں کے فضول اور بے معنی جھگڑے شروع ہو گئے اور نظم و ضبط کی دلیل خوبصورت قطاریں آہستہ آہستہ غنقا ہوتی گئیں۔ ہمارا سکول و تعریف، یعنی حمد باری تعالیٰ کے بعد شروع ہوتا۔ اُس حمد شریف کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

تو شاہوں کو گدا کر دے گدا کو بادشاہ کر دے

اشارہ تیرا کافی ہے، گھٹانے میں بڑھانے میں

سکول کی واحد دکان مالک چند کی لکڑی اور شیشے کی بنی ہوئی چھابڑی
تھی جو وہ سکول کی چار دیواری کے باہر پیپل کے درخت کے نیچے لے کر بیٹھا رہتا
وہ ایک روایتی ہندو تھا۔ جس کے سر پر ”لٹ“ دیکھ کر بڑی کراہت ہوتی۔ تاہم ہم
اُس کے باقاعدہ گاہک تھے اور اس سے ریوٹریاں اور پیڑے خرید کر بزمِ خودیش
عیاشی کی انتہا کر دیتے۔

قصہ مختصر یہ کہ آہستہ آہستہ یہ ماحول ناس آتا گیا اور مکتب کی اصطلاح
میں میں پکا سکولیا بن گیا۔

منشی الہدین محال دوسری جماعت کے انچارج تھے۔ وہ کم گو اور سنجیدہ
طبیعت کے مالک ہونے کی وجہ سے واقعی مرد ”حال“ تھے۔ ”دو دو نے چار“
سے لے کر ”سولہا سولہیاں“ دو سو چھپن تک پہاڑے اُنہوں نے ایسے یاد کرائے
کہ ابھی تک پوری طرح بھلائے نہیں جاسکے۔

اُن دنوں ٹیچر صاحبان اتنے گپ باز اور وقت ٹالنے والے نہیں ہوتے تھے
اس کے باوجود والدِ محترم نے گھر پر پرائیویٹ تعلیم کا خصوصی بندوبست فرمایا اور
سکول ہی کے سٹاف کے ایک بزرگ رکن جناب منشی نور الدین صاحب مرحوم
کو یہ فرض سونپ دیا۔ منشی صاحب کے طعام و قیام کی ذمہ داری خود قبول کی اور
”برسات“ سے ملحق محمد چدھڑ کے گھر کے دروازے کے عین بالمقابل جس کمرہ کا دروازہ
کھلتا تھا۔ اس میں منشی جی قیام پذیر ہو گئے۔ مرحوم اپنی ملازمت کے آخری سالوں

میں تھے اور دوا ڈھائی سال بعد یہاں ہی سے ریٹائر ہو گئے۔ وہ محنتی ہونے کے علاوہ
 ”حق حلال“ کی روزی میں ایمان رکھتے تھے۔ وہ پوری پابندی سے وقت مقررہ پر
 پڑھائی شروع کرتے اور پڑھائی کے لئے متعین اوقات سے پہلے کبھی فارغ نہ کرتے۔
 ویسے تو قبلہ بھائی صاحب بزرگوار اور بعض اوقات بھائی عبدالرسول صاحب بھی
 ان سے پڑھتے۔ لیکن محمد عباس مرحوم اس پڑھائی میں میرا واحد ساتھی تھا۔ محمد عباس
 چوہدری فتح علی مرحوم کا بیٹا تھا اور بعد میں وہ تپ دق کے مہلک مرض میں مبتلا
 ہو کر ۱۹۵۹ء میں فوت ہو گیا۔ وہ دلچسپ اور شریہ طالب علم تھا اور نشی جی کی
 ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کا زیادہ نشانہ بنتا۔ اس پرائیویٹ اور نجی تعلیم سے
 خود اعتمادی میں کافی اضافہ ہوا اور معیارِ قابلیت نسبتاً بہتر ہو گیا۔

جناب نشی نور الدین نہایت شریف النفس انسان تھے اور والدِ محترم کی
 دعوت پر ہمارے ہاں منتقل ہونے کے بعد بالکل یہاں ہی کے ہو کر رہ گئے۔ ہمارے
 دکھ سے دکھ اور سکھ سے سکھ۔

وہ حکمت سے بھی شغف رکھتے تھے اور بعض نہایت مفید اور جادو اثر نسنجے
 بڑی کامیابی سے آزما تے۔ کرم دین موچی ولد تاجو مرحوم ”اندر لٹے“ کا مریض تھا۔
 اور اس نامراد مرض کے ہاتھوں بڑا پریشان وہ اُسے کوئی دوائی دیتے جس سے
 اس کی بینائی رات کے اوقات میں لوٹ آتی۔ محمد عباس مذکور ایک دفعہ آشوبِ چشم
 کی تکلیف سے کافی عرصہ تک دوچار رہا۔ جناب نشی جی نے جب اس کی حالت
 بگڑتی دیکھی اور انگریزی دواؤں کے بے اثر اور فضول ہونے کا سب کو یقین ہو گیا
 تو اُس کے پاؤں کے انگوٹھا کے ناخن پر ایک پیلے رنگ کا محلول لگایا۔ جس سے اگلے

روز اُس کی آنکھ صحت یاب اور سُرخی وغیرہ سے بالکل صاف ہو چکی تھی۔ ان کے ایک رفیقِ کار
منشی عبدالغنی اُن سے معاصرانہ چشمک رکھتے اور ان کے خلاف ایک محاذ سانبانے
رہتے۔ لیکن اُنہوں نے ان کی ایسی ہلکی پھلکی حرکات کا کبھی سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا۔
منشی عبدالغنی اُس زمانے کے اساتذہ میں غیر سنجیدہ اور اپنے پیشہ سے متعلق روایات
کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کے لئے مشہور تھے۔ بعد میں اُن سے ایک افسوسناک
واقعہ بھی منسوب ہوا۔ جس کے ساتھ ہی غالباً وہ یہاں سے تبدیل ہو کر چلے گئے۔

چوتھی جماعت کے چند لڑکوں نے وظیفہ کے امتحان کے لئے تیاری شروع
کی تو منشی جی مرحوم نے میرا نام بھی تجویز کر دیا۔ امتحان کا مرکز پنڈ دادنخان تھا۔ جناب
منشی جی میرے ہمراہ گئے۔ ایک بڑے ہال میں تحصیل کے سب امیدواروں کی استعداد
کا جائزہ لیا گیا۔ باقی مضامین میں تو میری استعداد خاص نمایاں نہ تھی۔ البتہ یہ مسرت مجھے
آج تک یاد ہے کہ 'ملا' میں میں سارے مرکز میں اول رہا۔ مجھے تو جو خوشی ہوئی سو ہوئی
منشی جی اس طرح خوشیاں بکھیر رہے تھے جس طرح گویا ان کا اپنا بیٹا 'ولایت پاس' کر کے
ابھی ابھی لوٹا ہو۔ سبحان اللہ اب کہاں دُنیا میں ایسی ہستیاں ہیں۔

میں چوتھی جماعت سے ترقی یاب ہو کر مڈل کی جماعتوں میں آیا تو منشی جی مرحوم
بھی ریٹائر ہو گئے۔ وہ جہلم سے متصل ڈوہلی کے مضافات کے رہنے والے تھے۔ ایک
دو خط بھی موصول ہوئے لیکن افسوس کہ رابطہ کچھ قائم نہ رہ سکا اور اس طرح میں ایک شفیق
اور مخلص مرتی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

زہ شکستہ ام سبورا

مکتب سے نکلنے کے بعد سکول کا ماحول اب طبیعت میں بڑی حد تک رچ بس گیا تھا۔ لیکن ع۔ من اگرچہ تو یہ گفتہ نہ شکستہ ام سبورا کے مصداق مکتب سے میرا تعلق بہر حال وہی رہا۔ اسی عرصہ کے دوران استاد نواب صاحب کو حفظ قرآن پاک کے ایک معتبر اور مستند استاد جناب اورنگ زیب صاحب انکی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر چکے تھے۔ جناب اورنگ زیب صاحب کا بال بال ”استادین“ میں گنڈھا ہوا تھا اور وہ چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی اس حیثیت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ وہ رُعب دار شخصیت کے مالک تھے اور حد سے زیادہ سنجیدہ ہونے کے باعث طالب علموں کے لئے بے حد پراسرار۔ ان کی شبانہ روز محنت اور لگن سے درس شریف کا پرانا ماحول جو حافظ جی صاحب مغفور سے ہی مختص تھا پھر لوٹ آیا اور پھر وہی پرانی رونق اور بابرکت گہا گہی شروع ہو گئی۔ میں بھی اب بطور ناظر خواں درس میں شامل ہو گیا تھا اور سکول سے فارغ اوقات میں کچھ پڑھ لیتا۔ غلام مرتضیٰ ازویلی۔ عنایت شاہ از احمد آباد۔ حافظ افضل ولد حافظ جہانہ صاحب مرحوم اور حافظ عبید اللہ عرف بید اولد حافظ قائم دین صاحب (اللہ شریف) اسی دود کے قابل ذکر طالب علم ہیں۔ ہفتہ کے اختتام پر یعنی جمعرات کی شام بعد از نماز عصر استاد صاحب

ہر طالب علم سے 'رکوع' سنتے جس سے مسابقت کا مہتمم جذبہ پیدا ہوتا۔

استاد اورنگ زیب صاحب پرانے خیالات کے مالک (ORTHODOX) اور راسخ العقیدہ (RIGID) مسلمان تھے۔ چنانچہ زیادہ کھیل کود کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مثلاً گڈی کھیلنا تو گناہ دیکھ لینا بھی ان کے نزدیک "مخلافِ شرع" حرکت تھی۔ ایک دفعہ ہم چند اجاب "رمضان ولے پڑ" پر "ملی کوڈی" دیکھنے چلے گئے۔ اس بات کی بھنگ کہیں استاد صاحب کے کان میں پڑ گئی۔ ایک قاصد کے ذریعہ استاد صاحب کا پیغام جس قدر روح فرسا ہو سکتا تھا۔ اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔ واپس پہنچے تو استاد صاحب کا موڈ بہت خراب دیکھا۔ انہوں نے حکم دیا کہ سب کان پکڑ لو۔ حکم کی تعمیل میں سب نے ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کی۔ استاد صاحب سزا یافتگان کی لمبی قطار سے مخاطب ہو کر سخت ناراض ہو رہے تھے کہ غلام مرتضیٰ جو اس سارے ڈرامے سے بے نیاز، منسی ضبط کرنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا، کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ زور سے منس پڑا۔ استاد صاحب نے دل ہی دل میں اس زندہ دلی کی داد تو ضرور دی ہوگی لیکن ڈسپلن کی اس واقع خلاف وندی کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ انہوں نے ایک اور طالب علم کو بلایا اور اس کی پیٹھ پر ہتھاکر اسے سامانِ عبرت بنانے کی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ یہ سزا بھی غلام مرتضیٰ کا موڈ نہ بدل سکی۔

تو اں قاتل کہ از بہر تماشا خون من ریزی

من آن بسمل کہ زیرہ خنجر حوں خوارے رقصم

برادر بند گوار نے ۱۹۴۱ء میں رمضان المبارک شروع ہونے سے چند روز قبل

حفظِ قرآن پاک کی تکمیل کی اور جناب استاد صاحب کی "سماعت" میں نماز تراویح کے

اند قرآن شریف سُننا شروع کیا۔ رمضان المبارک اُس زمانے میں ایسے مہمان کی طرح وارد نہیں ہوتا تھا۔ جس کو اندر سے تار کر اکثر میزبان کہلوا بھیتے ہیں کہ ”ابھی ابھی اسپرو لے کر لیٹے ہیں“ بلکہ اس مبارک مہینہ کی آمد اُس مہمان کی مانند متصور ہوتی جو چند لمحوں کے لئے قیام کرے اور میزبان پر نوازشات کی بارش برسا کر رخصت ہو جائے۔ نزولِ قرآن پاک کے اس مہینہ کا انتظار بڑے شوق و ذوق سے کیا جاتا تھا۔ غلام محمد کنفش دوز سرف کو کی موچی جو نقارہ بجانے پر مامور تھا۔ بڑے اہتمام سے نقارہ بالکل نیا بنواتا اور اس کی نوک پلک سنبھالنے سنوارنے کی فکر میں ہوتا۔ محلے والے اپنی اپنی مسجدوں کے لئے حافظ صاحبان کی تلاش شروع کرتے تو دوسری طرف حافظ ’نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز‘ کے موڈ میں ہوتے۔ حالانکہ معاوضہ وغیرہ ملے کر نایا اس کی توقع رکھنا ایک گناہ سمجھا جاتا۔ صرف چچا جان کی حویلی ایک ایسی جگہ تھی جہاں حافظ قرآن مجید سُننے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے کیونکہ چچا جان کی سماعت میں قرآن پاک سُننا لذتِ خود ایک بہت بڑی سند تھی۔ ایک رمضان شریف میں متعدد ختم صرف چچا جان کے ہاں ہی ہوتے اور پوری پوری رات ایک محفل کا سماں رہتا۔

والدِ محترم بنگلہ پر ہی نماز تراویح ادا فرماتے اور چند نہایت ہی متبرک صورتیں مخصوص وقت پر پہنچ جاتیں جن میں سے میاں زمان صاحب، میاں محمد صاحب اور صوبیدار لعل خان صاحب مرحوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حافظ غلام محمد صاحب ’پیر پھلاہی‘ اور حافظ محمد بخش صاحب ’پھپھرا‘ اُس وقت بڑے ’اجل‘ حافظ سمجھے جاتے تھے اور دونوں ہی والدِ محترم کے بہت پسندیدہ بھی تھے۔ حفظِ کلام پاک

میں ان کی بختگی واقعی مثالی تھی۔ ان کی تلاوت کا بھی مخصوص انداز تھا۔ بے حد سادہ مگر انتہائی دلآویز۔ زمانہ ہوش کے ابتدائی دو ایک سالوں کو چھوڑ کر میری یادداشت کے مطابق اکثر حافظ محمد بخش صاحب ہی نماز تراویح کی امامت کرتے۔ والد محترم ان کا خاص خیال رکھتے تو دوسری طرف حافظ صاحب بھی ایک روایتی عقیدتمند کی طرح نہایت مؤدب اور دست بستہ حاضر ہوتے۔ نمازِ عشاء اور وتروں کی امامت بھی حافظ صاحب خود ہی کرتے جو والد محترم باقاعدہ اٹھ کر بحالتِ قیام ادا کرتے ویسے نماز تراویح وہ کھڑے ہو کر ادا کرنے سے معذور تھے کیونکہ زیادہ دیر تک نہ ان کے لئے کھڑا رہنا ممکن تھا اور نہ ہی دوزانو ہو کر بیٹھ سکتا تھا۔ میں اکثر ان کے پیچھے دوسری صف میں ہوتا اور ان کی ہر حرکت کو بڑے غور سے دیکھتا رہتا۔ وہ ناقابلِ بیان حد تک مسخو کن شخصیت کے مالک تھے۔ جس محفل میں ہوتے اللہ کی رحمت گلاب کے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح مسلسل برسی ہوں محسوس ہوتی۔ مجھے اس بات سے کوفت بھی ہوتی کہ وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھنے پر کیوں مجبور ہیں اس ضمن میں ایک بڑی عجیب روایت قاضی محمد امین صاحب چکوڑہ نے سنائی کہ سرہند شریف میں ایک مرتبہ حضرت مجدد الف ثانی امام ربانی کے عرس مبارک کے موقع پر ختم خواجگان پڑھا جا رہا تھا۔ پورے غیر منقسم ہندوستان کے مشائخ عظام اور پیرانِ طریقت جمع تھے۔ خلیفہ صاحب خود صدر مجلس تھے۔ ان شرکاء میں سے کچھ حضرات باقاعدہ دوزانو ہو کر نہیں بیٹھے تھے جو کہ خلافِ قاعدہ بات تھی۔ چنانچہ خلیفہ صاحب نے اشاروں سے انہیں دوزانو ہو کر بیٹھنے کا حکم دیا اور سب لوگ تعمیلاً ٹھیک ہو کر بیٹھ گئے۔ والد محترم نے بھی جو گوٹھ، مار کر بیٹھے ہوئے تھے، دوزانو ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس پر خلیفہ صاحب نے انہیں اپنی پہلی حالت

پر واپس آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن والدِ محترم اس سے متردد رہے اور خلیفہ صاحب کے اصرار کے باوجود بدستور دوزانو ہی بیٹھے رہے۔ یہاں تک خلیفہ صاحب نے ختم خواجگان روک دیا اور فرمایا کہ جب تک سجاد نشین اللہ شریف الٰہی پالتی مار کہ نہیں بیٹھیں گے ختم شریف شروع نہیں ہوگا۔

سرہند شریف کے ضمن میں ایک اور قیمتی روایت عم محترم کی زبان سے سننے کا اتفاق ہوا کہ ایک مرتبہ عرس شریف کے موقع پر حضرت ملا شور بازار جو کہ حضرت مجدد الف ثانی امام ربانیؒ کی اولاد میں سے تھے اور افغانستان کے واحد روحانی پیشوا تھے۔ عرس مبارک پر سرہند شریف تشریف لائے۔ حضرت مجدد الف ثانی امام ربانیؒ کی اپنی اولاد ہونے کے سبب وہ بے حد عزت و تکریم کے مستحق تھے۔ چنانچہ لاکھوں کا مجمع آپ کی زیارت کے لئے ٹوٹ پڑا۔ حضرت ملا شور بازار جو انتہائی بے لوث اور بے نیاز شخصیت کے مالک تھے۔ کس کس کو خاطر میں لاتے چنانچہ ان کا ایک نظر دیکھ لینا ہی بہت بڑی سعادت سمجھا جاتا۔ جب والدِ محترم بھی اس گوشے میں مصافحہ کے لئے آگے بڑھے تو حضرت ملا شور بازار اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور آگے بڑھ کر ان کو گلے لگا لیا اور ماتھے پر بوسہ بھی دیا۔ یہ منظر لوگوں کے لئے بہت ہی عجیب اور ناقابلِ فہم تھا۔ لیکن ے

داغے کہ سوزد در سینہ من

اں داغ کم سوخت در لالہ زاراں

رہ تہ شریف

عہدہ طفلی کا وہ زمانہ جب ”تھے دیارِ نو زمین و آسماں میرے لئے“ بہت ہی خوب تھا۔ بچپن کی وہ یادیں مجھے بڑی ہی عزیز ہیں جو ہمارے ننھیال کے گاؤں رہ تہ شریف کی طرف سفر سے متعلق میرے ذہن کے ایک قدیم لیکن بے حد متبرک گوشہ میں محفوظ ہیں۔ والدہ محترمہ کے ہمراہ ہم رہ تہ شریف کے سفر پر روانہ ہوتے۔ اس سفر کے لئے موسم مخصوص تھا اور یہ سفر صرف موسم گرما ہی میں اختیار کیا جاتا۔ لیکن کنڈل کے ایک صوفی شاعر میاں الہی بخشؒ کے بقول اس شان کے ساتھ کہ

ادھی راتیں کوچِ جنہاںدا پہلی رات تیاری

حقیقت یہ ہے کہ آخر شب کی وہ اُداس چاندنی میرے ذہن سے آج تک محو نہیں ہو سکی۔ رہ تہ شریف سے زیادہ اُس کا راستہ ہمیں پُر رومان معلوم ہوتا۔ سردھی سے نلکوں کے ذریعہ محفوظ کئے جانے والے پانی کے ذخیرہ (RESERVOIR) المعروف ”تالاب“ سے ہماری ملاقات، صرف اسی سفر کے دوران ہوتی جو لہ سے کھارہ کی طرف صرف دیرھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ ”گلیانی ٹوٹی“ اور ”ترکھانی ٹوٹی“ یہ بالکل عام قسم کے الفاظ ہمارے لئے بڑے بامعنی اور پرکشش تھے۔ یہاں سے آگے آہستہ آہستہ کھارہ کے پہاڑوں کی ہیئت کذائی تبدیل ہونا شروع ہو جاتی اور ”دور درشن“

سے جما ہوا حسین نقش (IMAGE) پاش پاش ہو کر رہ جاتا۔ پہاڑ کی خاصیت کا یہ پہلو
 شانڈہستی کے عام باسیوں پر بھی صادق آتا ہو۔ بہر حال کھارہ کی وادی میں گم ہو کر
 جب ہم پستی کی تہہ کو پہنچ جاتے تو دوسری طرف سردی کی بلندی اور عظمت بھی ہمارے
 استقبال کے لئے تباہ ہوتی۔ ”بن سیال“ سے کافی آگے اور کلمہ کہاں سے کچھ پہلے
 ڈسٹرکٹ بورڈ کی پرانی سڑک کے کنارے ایک کہنہ اور عمر رسیدہ ”ٹنڈ منڈ“ درخت
 سے ہماری بڑی آشنائی تھی۔ سارا سال دعا کرتے کہ ایک مرتبہ پھر اُسے دیکھ لیں اس
 درخت سے اُنس اس وجہ سے بھی تھا کہ انتہائی کمزور اور فلاکت زدہ ہونے کے
 علاوہ قدیم زمانہ کی کوئی نشانی معلوم ہوتی اور سرگوشیوں کی زبان میں شکوہ کناں کہے

نہ گلم نہ برگِ بنرم نہ نہالِ سایہ دارم

در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

اُگے بڑھ کر بلندی سے جب کلمہ کہاں کے پُربہار باغات اور خوشگوار سینہ زار

پر نظر پڑتی تو سبحان اللہ ہے

تو کوئی کہ نیرداں بہشتِ بریں مرا

نہاواست در دامنِ کوہسارے

یہاں سے اُگے تو پھر ”سینو نام محمد والا لگدا بہت پیارانی“ کی تکرار کرتے

ہوئے رتہ شریف کی حدود میں داخل ہو جاتے۔ ایک موقع پر ان تاثرات کو میں نے

اس طرح بیان کیا تھا:

”رتہ شریف میل ڈیڑھ میل دُور سے ہی نظر آنے لگا اور ہم

اس کی ایک جھلک دیکھتے ہی جنتِ ارضی کے تصور میں گم ہو

جاتے۔ خاص طور پر جب پرانی وضع کے لوگ استقبال آگے
 بٹھتے تو ہم انہیں آسمان سے اُتری ہوئی نہایت متبرک
 مخلوق تصور کرتے۔ ایک شاعر کو ہماری کیفیت کا شاہد
 علم ہو گیا ہے

مکین تھے یا کسی کھوئی ہوئی جنت کی تصویریں

مکانِ اس شہر کے جھولے ہوئے پسینے لگے ہم کو“

گھر میں داخل ہوتے تو ایک بڑا اور کشادہ صدر دروازہ عبور کرنا ہوتا۔ میں تو
 اُسے بار بار چھو کر اپنی اُداسی ختم کرتا۔ اس گھر کی ہر چیز کے لئے ہم بے حد اُداس ہوتے
 اور داخل ہو کر ملنے ملانے سے بے نیازا نہی کے نظارے میں گم ہو جاتے۔ گھر کا صحن خاصا
 کشادہ تھا۔ اس کو ایک نظر دیکھ کر ایک اطمینان سا ہوتا۔ صفحہ سے گزر کر پہلے نئے
 اور پھر پرانے محل، میں داخل ہوتے۔ پرانا محل، حضرت مفتی امام دین صاحب قدس
 سرہ العزیز، والد ماجد حضرت مفتی عطا محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تعمیر کرایا تھا اور
 اس کی بھینی بھینی مخصوص خوشبو ماضی کی دلفریب یادیں پھر سے تازہ کر دیتی اور میں
 فیضان کی ایک خاص کیفیت سے مستفیض ہوتا۔ نانی جان ایک سایہ رحمت تھے۔
 لیکن نانی صاحبہ ہمیں دیکھ کر کسی خوشگوار ردعمل کا اظہار نہ کرتے اور موقع پا کر ہماری
 واپسی کی تاریخ کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے۔ مکان کی چھت پر فوراً چڑھ جاتے
 اور گرد و نواح سے اس طرح اکتساب فیض کرتے کہ کوئی حسرت باقی نہ رہتی۔

شورخ سے دُور، بہت دُور پُرسکون خاموشی میں ڈوبی ہوئی یہ چھوٹی سی بستی
 واقعاً اثر انگیز ماحول پیش کرتی اور لیلیٰ شب، کی زلفِ رسا، کھل جانے کے بعد تو یہ

ماحول پڑا سرا بھی ہو جاتا۔ دُور دُور تک پھیلی ہوئی پہاڑی چوٹیوں کی تنہائی سُبْحان اللہ

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو قِدا

وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

اُس زمانہ میں رتہ شریف کا گھر مکمل طور پر آباد تھا اور یہ ویرانی جو آج اس کے

مقدر میں لکھی نظر آتی ہے اُس وقت اس کا دُور دُور تک کوئی نشان دکھائی نہ دیتا۔

ہمارے ورود سے تو اس کی رونقیں اپنے نکتہ کمال تک پہنچ جاتیں۔

صحن میں علی ابصیح پڑیوں کے چھپانے بلکہ شور سے آنکھ کھلتی۔ وہ صُفّہ کے پنجروں

میں اس طرح پھکتیں کہ اُٹھے بغیر کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(نانا جان) اپنی مصروفیات نسوخ کر کے زیادہ عرصہ ہمارے ساتھ گزارتے ساتھ ہی

درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع رہتا۔ ”شیخ عبداللہ“ نامی ایک درویش کو درس

دیتے ہوئے نانا جان بڑی خوبصورت لے میں فارسی کے اشعار پڑھتے اور ان کی

تشریح فرماتے۔ یہ ماموں جان مفتی عبدالقدوس صاحب ہاشمی کے شباب

کے دن تھے۔ اُس زمانے میں وہ قابل رشک صحت کے مالک اور بڑے بہرہ و عزیز

گتے اور بڑے ”فیشن ایبل“ اور ”اُپ ٹو ڈیٹ“ نظر آتے۔ بڑے ماموں جان جناب

عبدالرزاق عبرت البتہ ”درویشِ خدا مست نہ شرتی ہے نہ غربی“ تھے اور ”نکلے کبھی

گہن سے آئے کبھی گہن میں“ کی ایک رنگین صورت۔ نانی صاحبہ کے گرد گھر کا سارا

ماحول گھومتا وہ بلا شرکت غیرے اپنے گھر پر بڑی موثر حکمرانی کرتے۔ رسولی میں ہم ان

کے پاس ہی بیٹھ جاتے اور اُس زمانے کے ٹفن کیریر یعنی ”سرپوس“ سے گرم گرم

روٹیاں نکال کر کھانا شروع کر دیتے۔

یہاں ایک پُرین چہرے والے بزرگ جناب فضل کریم صاحب درسی قرآن پاک کے اُستاز تھے۔ یہ درسی مسجد سے بلحقہ جنوبی طرف صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ اُستاد صاحب موصوف بہا میں اپنے گھر کے اُستادوں کے مقابلہ میں فرشتہ رحمت نظر آتے۔ وہ بڑے ہی باصفا اور حَلِيمٌ الطَّيِّبُ بزرگ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وقفہ وقفہ سے وہ اپنی ”دھانگہ“ نما سوٹی سے طالب علموں کو پڑھائی کی طرف متوجہ کرتے رہتے۔

قاری عبید اللہ صاحب (میرے خالہ زاد) سے پہلی مرتبہ میں یہاں ہی متعارف ہوا۔ یہ تعارف آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ رتہ شریف کے قیام کے دوران کوئی بھی پروگرام ان کے بغیر مکمل اور کامیاب نہ ہوتا۔ ان کا ایک بازو غالباً ٹائیفائیڈ کی وجہ سے فعال نہ رہا تھا۔ دوسری طرف میری زبان میں تو تلاپن تھا اور میں حرف ’س‘ کو اس طرح ادا کرتا کہ یہ ’ش‘ اور ’خ‘ کا دلچسپ ملغویہ بن جاتا۔ ایک دن طے یہ پایا کہ اگر وہ میرے تو تلاپن کو ٹھیک کر دیں تو میں ان کے بازو کا نقص دُور کر دوں گا۔ میں نے تو یہ نقص کیا دُور کرنا تھا البتہ قاری صاحب نے نہایت باریکی اور احتیاط سے مجھے ”س“ کا مخرج اس طرح سمجھایا کہ میں اس کی بالکل درست ادائیگی کے قابل ہو گیا۔

رتہ شریف میں میں جن حضرات سے متاثر ہوا کرتا تھا ان میں حضرت مفتی دین محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ نانا جان کے بڑے بھائی تھے۔ اتنے پرہیزگار اور سادہ طبع بزرگ کہ ان کو ایک نظر دیکھ لینے سے قرونِ اولیٰ کے بزرگانِ دین کا تصور ذہن میں اُبھر آتا۔ ثانی حضرت قدس

سرۃ العزیز سے خلافت تھی۔ چہرے سے نور کی شعاعیں چھوٹی رہتیں۔ بڑے پُر غلوں اور شفیق تھے۔ پابندی شریعت کے معاملہ میں البتہ بے حد سخت گیر۔ ایک روایت کے مطابق والدِ محترم فرمایا کرتے کہ ریڈیو اس زمانہ کی ایک ضرورت ہے مگر حضرت مفتی صاحب موصوف کی زندگی میں یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔

اُن کا اپنا درسِ قرآنِ پاک تھا۔ خاصی تعداد میں درویشِ حفظِ کلامِ پاک کے لئے اُن کے ہاں مقیم رہتے۔ بعید اللہ صاحب اور اُن کے برادرِ اصغر عنایت احمد صاحب نے اپنے دادا جان ہی سے حفظِ قرآنِ پاک کی نعمتِ لازوال حاصل کی۔ ان کی تلاوت بڑی پُرسوز اور وجد آور ہوتی۔ ایک مرتبہ ۲۴-۶۱۹۴۳ میں آپ معراج شریف پر بللہ شریف آئے۔ نمازِ ظہر کے بعد ختم شریف کا پروگرام رکوعِ خوانی سے شروع ہو چکا تھا۔ آپ بھی اس مجمع میں تشریف رکھتے تھے کہ اچانک والدِ محترم نے آپ سے رکوعِ پڑھنے کی فرمائش کر دی۔ وہ اُٹھے اور اسٹیج پر ہاتھ باندھ کر اور آنکھیں بند کر کے تلاوتِ کلامِ پاک شروع کر دی۔ سبحان اللہ! میں نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ مجمع پر سکوتِ حیرت طاری ہوتا گیا اور لوگوں کی آنکھیں ان کے شعاعیں چھوڑتے ہوئے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ خود والدِ محترم جو ہمیشہ ”نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوہ دوست“ کی ایک پُر وقار تفسیر ہوتے نگاہ اُوپر اُٹھائے انہیں دیکھتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ نزولِ فیضان کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۶۱۹۴۶ میں اُن کی وفات ہوئی اور ان کی مخصوص روایات و برکات بھی

انہی کے ساتھ دفن ہو گئیں۔

خستہ فقیر کہا کرتا ہے

لگھی رت گلاباں والی مٹھے آن دھتورے

اور غالب نے کہا تھا ہے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ لے لے لے

تو نے یہ گنج مانے کہا نما یہ کیا کئے

ایک سُرخ و سپید معمر بزرگ میاں رانجھن، بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ وہ مسجد کے شمال میں حجروں کی نجلی منزل میں رہا کرتے۔ خشک چہرہ اور قابل رشک صحت کے مالک تھے۔ ان کے چہرے پر سفید چاکریں دائری بڑی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ہفتی صاحب (نانا جان) کے خادم بھی تھے وہ جب کبھی ”پار“ یعنی نہری علاقہ میں جانے کے لئے لڈہ شریف سے گزرتے تو میں انہیں ”سفیر رتہ“ سمجھ کر ان کی زیارت کرتا۔

خستہ فقیر جس کا اوپر ذکر آچکا ہے یہاں کی ایک خاص رونق تھی۔ وہ

ایک ایسی مختصر سی دنیا تھی جو آپ ہی اپنی ولایت بھی تھی۔ ہر آدمی اس کے لئے ”بھنیا“ (بھانجہ) اور ہر عورت اس کے لئے ”بھنٹی“ (بھانجی) تھی اور اس طرح وہ خود گویا ساری دنیا کا ”ماما“ تھا۔ پہلے پہل میں اس کی اس رشتہ داری سے بڑا تاثر ہوا لیکن ایک روز جب اس نے میرے سامنے ایک معرعت کو ”بھنٹے بھنٹے“ کہہ کر دکھایا اور اس حالتوں نے کسی تعجب کا اظہار کئے بغیر بات شروع کر دی تو میرا سارا تاثر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

لوگ خستہ فقیر کو مکر و فریب کا شاہکار بھی تصور کرتے لیکن میرے خیال میں بات

ایسی نہیں تھی۔ وہ اچھی خاصی جائیداد کا مالک تھا اور چک بھون گاؤں میں اس کی

برادری بھی تھی لیکن اچانک ایک ذہنی انقلاب سے اس طرح دوچار ہوا کہ سب کچھ
اللہ کے نام پر وقف کر دیا۔ گویا اس نے

”دنیا نے ہمیں چھوڑا جیہی ہم چھوڑنے دیں کیوں دنیا کو

دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے“

کانعرہ متانہ لگایا اور حضرت مفتی دین محمد صاحبؒ کے دامنِ عافیت میں ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے خلوت گزیں ہو گیا۔

درس نظامی

یہ ایک بہینہ ہمیشہ بڑی سروت سے گزر جاتا اور میں ان پیاری یادوں کو
دل میں بسائے واپس اپنے گھر پہنچ جاتا۔ بڑی عجیب بات ہے کہ یہاں کا ماحول
رتہ شریف کے مقابلہ میں خاصا بوز معلوم ہوتا۔ نہ دھراب، نہ دھیبہ، نہ پدھی،
نہ ہٹی، حتیٰ کہ جمال دین صاحب کا وہ قدا اور اوصاف کتا المعروف 'شوکی' بھی
نظر نہ آتا جسے بعد میں انہوں نے غالباً بھیرٹوں اور بکریوں پر دست درازی کی
پاداش میں ایک بلند چوٹی سے جو ان کے دھراب میں واقع 'جند رے' سے مغرب کی
سمت واقع تھی نیچے پھینک کر ہلاک کر دیا تھا اور جس کی دل و ذہنہ چیخ کا ذکر عنایت احمد
صاحب آج بھی افسوس کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔

۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۳ء کے لگ بھگ والد محترم نے مسجد خالقہ شریف کے
مینار اور مسجد کے سامنے والے حصہ پر نقش و نگار بنوانا شروع کئے۔ اس سے پیشتر
مسجد کے مینار اور اس کی چھت برابر تھے گو یا مینار بالکل نثار و مستری صاحبان
خانے کا رنگ اور نیک نیت لوگ تھے۔ والد محترم کام کی خود نگرانی فرماتے۔ اسی زمانہ
میں جناب بلادر بزرگوار نے قرآن پاک ختم کر لیا تھا۔ چنانچہ والد محترم نے ان کے
سلسلہ تعلیم کو جاری رکھنے کی غرض سے درس نظامی کا یہاں بندوبست فرمایا اور

مولینارشد احمد چھنی کہنہ ضلع گجرات کو بطور مدرس اعلیٰ یہاں مدعو کر کے یہ خدمت ان کے سپرد کر دی۔ مولینارشد احمد ایک قابل قدر اور بزرگ استاد تھے۔ جناب استاد صاحب مرحوم کی آمد ایسے تھی گویا طر۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا

اب مسجد خالقہ شریف میں کہا گئی کہ یہ حال تھا کہ ایک میلہ کا سماں رہتا۔

مدرسہ حفظ قرآن پاک اب مدرسہ درس نظامی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ استاد صاحب کے جلو میں درس نظامی کے طالب علموں کا ایک گروہ بھی یہاں پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے عربی و فارسی کتب ”ٹھوک بجا“ کر پڑھی تھیں اور پڑھانے کا فن بھی خوب جانتے تھے۔ دہلی کے مدرسہ امینیہ کے فارغ التحصیل تھے اور چھنی کہنہ، جیسے دور افتادہ دیہات سے تعلق کے باوجود نہایت نفیس ذوق اور نستعلیق شخصیت کے مالک تھے۔ کرمیا سے لے کر دورہ حدیث تک خود پڑھاتے۔ میں نے فارسی کی ابتدا شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے اسی کرمیا سے کی اور زانوئے تلمذانہی کے سامنے تہہ کیا۔ استاد صاحب ”در خدمتِ تجیل“ کے عنوان کے تحت جب اس شعر پر پہنچے:

وگر در کفش گنج قارون بود

وگر تا بعش ربع مسکون بود

تو ربع مسکون کی تفسیر ایک گول دائرہ بنا کر کی جس میں چار خانے بنائے اور ایک خانہ روشنائی سے رنگین کر دیا۔ فرمایا یہ وہ حصہ ہے جہاں انسان آباد ہیں اور باقی تین حصے پانی پر مشتمل ہیں۔ میرے نزدیک دنیا چونکہ صرف خشکی کا نام تھا لہذا بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیا اب جنس در حقیقت اتنی فراواں ہے۔

مولینا بڑے سلجھے ہوئے اور دھیمے مزاج کے بزرگ تھے۔ والدِ محترم نے جنوبی قبرستان سے ملحق خالی جگہ پر ان کے لئے دو کمروں پر مشتمل ایک رہائش گاہ تعمیر کروائی جن میں سے مغربی کمرہ آج تک بفضل اللہ تعالیٰ اپنی اصلی حالت پر موجود ہے۔ درسِ نظامی کے طلباء خاصے خوش فکریے لوگ نظر آتے اور گاؤں سے باہر الگ تھلگ ماحول میں اپنی دنیا آباد کئے رہتے۔ مولوی سیف الدین صاحب سالی، مولوی محمد یونس، محمد صدیق، محمد شفیع، مولوی محمد اسمعیل ازہرین اور ”گہنا“ ”زعمائے طلباء“ میں سے تھے۔ ان لوگوں نے مسجد کے ماحول کو ایسی رونق اور زندگی دی کہ پھر اس کے بعد وہ رونق دیکھنے میں نہ آئی۔

والدِ محترم اس پروگرام سے بڑی دلچسپی رکھتے۔ اکثر مولینا رشید احمد صاحب سے درس سے متعلق مسائل پر گفتگو فرماتے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے سے متعلق باتیں ہوتی رہتیں۔ اس درسِ نظامی کی ابتداء نے فی الواقع سارا ماحول تبدیل کر کے رکھ دیا۔ مولینا بعد از نمازِ مغرب گاؤں آجاتے اور والدِ محترم کے سامنے اُپر چھت پر دیگر شاہلیں کے ساتھ دیر تک مراقبہ میں رہتے۔ دراصل مولینا اسباقِ تصوف ہی کے ضمن میں یہاں منتقل ہونے پر آمادہ ہوئے تھے۔ یہ مراقبہ ویسے تو بعد از نمازِ فجر ایک معمول تھا اور والدِ محترم کی موجودگی میں اس کے ساقط ہونے کا کوئی موقع مجھے یاد نہیں۔ تاہم نمازِ مغرب کے بعد مراقبہ کا یہ تیا معمول، ایک طرف والدِ محترم کے دل میں مولینا کے لئے نرم گوشہ کا آغاز تھا تو دوسری طرف مولینا کے دل میں عرفان و معرفت کا جو ذوقِ سلیم تھا اس کا آئینہ دار۔ یہ شاید اس لئے کہ مولینا ظاہری علم کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اپنے باطن کو منور کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔

اگر ز آتش خود شرارے بگیری
تو اں کرد زیر فلک آفتابی
حیات است در آتش خود پیدن
خوش آن دم کہ این نکتہ را بازیابی

اس مراقبہ کا کیف و سرور تو ان لوگوں کو علم ہوگا جو اس سے فیضیاب
ہوتے تھے مجھے البتہ وہ نعتیں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں جو محمد شفیع اور محمد صدیق
بل کر پڑھتے پھیپھروں کے کوٹھا سے ملحقہ چھت پر والد محترم جنوب مشرقی کونہ
میں ایک نیم دروازہ کرسی پر تشریف فرما ہوتے۔ سامنے دری پر مولینا اپنے ساتھیوں
سمیت توجہ کی حالت میں بیٹھ جاتے۔ ان پر سوز اور وجد اور نعتوں میں
سے اکثر مجھے اب تک یاد ہیں۔

قدموں میں مصطفیٰ کے میرا مزار ہوتا
وہ خاک پاک ہوتی یہ خاکسار ہوتا

جہاں روشن است از جمال محمد
دل زندہ شد از وصال محمد
نوشا مسجد و منبر و خانقاہ ہے
کہ دروے بود قیل و قال محمد
بصدق و صفا گشتہ بے چارہ جانی
غلام غلامان آل محمد

مرحبا سید مکی مدنی العسری
 دل و جان یاد فدائت چہ عجب خوش لقبی
 شب معراج عروج تو زہ افلاک گزشت
 بہ مقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی
 نسبت خود بسگت کردم و بسے منفعلم
 ز آنکہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے اہلی

اس طرح کی پرانی اور برگزیدہ شخصیتوں کی سوزِ عشق میں ڈوبی ہوئی نعتیں
 ایسی مجلس میں عجیب سماں پیدا کر دیتیں۔ حافظ شیرازی کی یہ نزل بھی باقاعدہ نعتوں میں
 شامل تھی اور دونوں نعت خواں اسے بھی بڑے ذوق و شوق سے جھوم جھوم کر
 پڑھتے۔

بفراغ دل زمانے نظرے بہ ماہ روئے
 بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز دہوئے
 بخدا کہ رشکم آید بدو چشم روشن خود
 کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے
 نفسم باخر آمد نظرم ندیدہ سیرت
 بخبریں نماں مارا ہوسے و آرزوئے

نعتوں کا یہ سلسلہ اتنا پرفیس تھا کہ پوری فضا رحمتوں اور برکتوں سے معمور رہتی۔
 یوں تو یہ سلسلہ بہت قدیم تھا اور اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کے مبارک دور
 میں نعت خواں موجود رہتے۔ چنانچہ چوہدری احمد خان صاحب کے والد بزرگوار

ایک خوش الحان نعت خواں تھے لیکن اُس دور کے حمد و ثنا پڑھنے والے لوگوں کے نام کہیں محفوظ نہیں۔ البتہ رمضان چھٹروں درویش اور پونی "از نور خانیوالہ کے نام ہم نے ضرور سنے جو اس صنف کے ناموروں میں شمار کئے جاتے۔ لیکن یہ میرے ہوش سے کافی پہلے کی بات ہے۔ مولوی شاہ محمد صاحب از سرلہ (گجرات) والدِ محترم کے مقرب خاص تھے۔ ان کی سُرخ رنگ کی رومی ٹوپی اور اس کا پھندنا خواب کے تصور کی طرح میرے ذہن میں ایک ہیو بلا سا بناتے ہیں ساتھ ہی ان کی متشرع ریش کا تصور بھی ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

”ہے شان جو احمد پیارے دا

نہیں شان اوہ عالم سارے دا“

اُن کی مترنم آواز میں سُنا تھا کتنی عالمگیر حقیقت وہ کس سادگی اور پُر سوز ترنم سے ادا کر دیتے۔ سبحان اللہ! شاہ محمد صاحب متقدمین کی نشانی تھے اور نعت خوانی میں وہ اپنے دور کے یکتائے روزگار۔ حافظ قائم الدین کی نعت میں نے البتہ خوب سُنی۔ حافظ صاحب بھی اپنے زمانہ کے ایک بے مثل نعت خوان سمجھے جاتے۔

صبح کی نماز والدِ محترم خود پڑھتے۔ صبح کی قرأت خاصی طویل ہوتی۔ پڑھنے کا انداز سادہ مگر بے حد دلکش و دلنشیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کتنے خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہیں ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا شرف نصیب ہوا۔ سلام و پھیرنے کے بعد سب لوگ بالکل خاموشی سے تسبیح پڑھتے ذکرِ جہر قسم کی کوئی چیز اُس وقت مروج نہ تھی۔ جب دُعا کے لئے والدِ محترم ہاتھ اٹھاتے تو سب لوگ مکمل سکوت کے ساتھ ان کی پیروی کرتے اور اسی طرح کامل سکوت ہی کے عالم میں اُٹھ کر

رخصت ہو جاتے۔ البتہ چوہدری محمد حیات صاحب کا کھگھورا بعض اوقات فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیتا۔ یہ تھی اصل نقشبندیت جس کا آبِ خود نقشبندیوں میں نام و نشان باقی نہیں رہا۔

اُفتاد بدام خویش نشا خست مقام خویش
عشقے کہ نمودے خواست از نعرہ یارب ہا

اس کے بعد ختم خواجگان میں شامل ہونے والے حضرات ایک مستطیل نما گول دائرہ بناتے اور ایک گہرے رنگ کی سبز چادر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بچھ جاتی۔ بدر دین درویش (سگھر) ایک گتھی سے گوٹیاں اس چادر پر اُلٹ دیتے اور دعائے خیر کے بعد ختم شریف شروع ہو جاتا۔ اس کی سربراہی شروع شروع میں بدر دین مرحوم اور مستری فتح محمد صاحب از مجلوال ہی کے سپرد تھی لیکن ان کی وفات پر صوفی صدر دین صاحب کفش دوز اور حاجی محمد مرزا صاحب درویش از جندران نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ ختم شریف میں نظم و ضبط کا زبردست اہتمام ہوتا تھا، دوزانو بیٹھتے اور کیفیت یہ کہ آنکھیں بھی اپنی گوٹیوں پر مرکوز رکھتے۔ ختم شریف کے اختتام پر مراقبہ شروع ہوتا تو گویا حافظ قائم الدین صاحب علی میدان میں نکل آتے فارسی نعتوں کے علاوہ اُردو اور بعض پنجابی نعتوں کا پرسوز ترنم حافظ جی ہی کا حصہ تھا۔ ان کی آواز باریک اور سُریلی تھی اور ایسی پاکیزہ روحانی محفل میں اس کا جادو بڑا موثر ہوتا۔

عرش است مکین پایہ زلیوانِ محمدؐ

جبریل امین خادمِ دربانِ محمدؐ

یک جاں چہ کند سعدی مسکین کہ دوہد جاں
سازیم فدائے سگِ دربانِ محمدؐ

جب نورِ نبیؐ عرش کے ایوانوں پہ چمکا
گرہی نے یا چوم غبارِ اُس کے قدم کا

حافظ صاحب ”ایوانوں پہ چمکا“ کو ”ایوانیہ چمکا“ پڑھتے اور اس طرح
دل لگی کا سامان بھی ہو جاتا۔

۱۹۴۵ء میں شبِ برات کے موقع پر رات کو مسجدِ خانقاہ شریف کے
صحن میں رات گئے حافظ جی نے حضرت پیرِ قصوری وائم الحضورِ قدس سرہ العزیز
کی یہ نعت پڑھی

فلک پر شور تھا ہر جا رسول اللہ آتے ہیں
ہر اک عرشیں یہ کہتا تھا رسول اللہ آتے ہیں
شفاعت کی اجازت لے کے جب آئیں گے بخشش میں
گناہگاروں کا نخل ہو گا رسول اللہ آتے ہیں

شبِ برات کی فیوضات سے نبیؐ نبیؐ آشنائی تھی اور یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ
استاد صاحب مولینا صاحب از موضع ”ودھن“ (تحصیل جھلوال) کی تلقین و وعظ
سے آتش بازی سے تائب ہوا تھا۔ یہ نوافل کی محفل تھی چاند کی پرنور کرنیں مزارِ مبارک
کی کوٹھڑیوں سے نیچے اتر کر مسجد کے صحن کو تابندہ کر رہی تھیں۔ رات ڈھل چکی تو چند
احباب نوافل کے درمیان بستانے کی غرض سے تھوڑی دیر کے لئے بصورتِ دائرہ

ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ نعت شریف کے پڑھنے اور روح پرور ترجمے نے اس مختصر سی مجلس کو سحر زدہ کر دیا اور یہ کیفیت میرے ذہن کو آج بھی بدستور متاثر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

ہاں تو ذکر تھا مولانا رشید احمد صاحب کے اس دور کا جب مسجد خالقہ ثانیہ میں ہر طرف رونقیں تھیں اور طلبائے درس نظامی فارغ اوقات میں: ط
چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن

کا نمونہ پیش کرتے۔ مولانا ایک اچھے مقرر بھی تھے اور حضرت مفتی صاحب (رحمۃ شریف) سے تلمذ کی بناء پر مثنوی مولانا کے روم کے اشعار سے اپنے مقالات کو مزید دلنشین بنا دیتے۔ مولانا مثنوی کے اشعار کو حضرت مفتی صاحب کے تتبع میں اسی لے سے پڑھتے جو ان کے استاد مکرم کا انداز تھا اور اس طرح کی یہ کامل تقلید صرف مولانا ہی کے حصہ میں آئی۔ مولوی محمد اسمعیل درویش ازبکن کے نزدیک یہ تقلید مستحسن نہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے مولانا کو حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ سے جو والہانہ عقیدت تھی یہ اس کا ایک فطری تقاضا تھا: ط

عاشقان بندہ حال اندچناں نیز کنند

حضرت مفتی صاحب اپنی مسکور کن شخصیت کے تناظر میں جب علم کے بحرِ ذہان سے نایاب موتیوں کی لڑیاں نکال نکال کر لاتے تو مولانا سر جھکانے مسلسل روتے رہتے اور دل و جان سے قربان ہوتے رہتے۔

سبحان اللہ! ایک زمانہ تھا جب حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کے بغیر کسی

بھی محفل کسی بھی تقریب بالخصوص معراج شریف کی مبارک تقریب کا تصور بھی قریب

قریب ناممکن تھا۔ آپ ایسی محفلوں کے روح رواں ہونے اور عقیدتمندوں کے
 جھرمٹ میں علم و عرفان کے نور کی شعاعیں بکھیرتے چلے جاتے۔ افسوس کہ اس
 قلیل عرصہ کے دوران میں ایسی تبدیلی رونما ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان اثر انگیز
 و عہد آفرین شخصیتوں کا نام تک لینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

وہ لوگ کیا ہوئے وہ زمانہ کدھر گیا

یہ ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۱ء کی بات ہے میں عرس شریف کے اجتماعات میں نعت خوانی
 اور تقریروں کا بڑی بے تابی سے انتظار کرتا مسجد میں سائبان کا تناؤ دل کو بے پناہ
 مسرتوں سے بھر دیتا اور ایسے ماحول میں جو صرف عرس یا معراج شریف ہی کے موقع کا
 مرہونِ منت ہوتا۔ ہر طرف چہل پہل سے موڈ بڑا خوشگوار ہو جاتا۔ مولانا امیر الدین
 صاحب گول پوری کی ہمراہی میں آنے والے حافظ محمد صدیق نابینا کی نعت میں بڑے
 ہی شوق سے سُندا۔ غنمیں کی اکثریت میرے نزدیک تفسیح اوقات کا موجب
 ہوتی جس سے میں سخت بور ہوتا۔ اس میں حضرت مفتی صاحب البتہ استثناء کی حیثیت
 رکھتے ہیں ان کی باوقار اور پُرہین شخصیت کا بڑا اچھا اثر قبول کرتا۔ وہ جب بھی
 بحیثیت مقرر ایٹج پر تشریف لاتے کیف و وجدان کی بارش برسا دیتے۔ میں معمولاً
 یہ منظر شیش محل کے اندر سے والدِ محترم کی نشست گاہ والی باری سے دیکھتا۔ زندگی
 میں پہلا فارسی کا شعر میں نے ایسی ہی کسی تقریر میں حضرت مفتی صاحب کی زبان
 سے سنا اور پھر وہ آج تک ایسے ہی تازہ ہے جیسا کہ پہلے دن تھامے

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
 وے طیبِ جملہ عُلّت ہائے ما

کمال علم و فضل کے باوصف آپ بڑے پُر بہار انسان تھے۔ تقریر کے دوران میں حاضرین مجلس اچانک سنس پڑتے تو علم کی سنجیدہ گفتاری کا ماحول وقتی طور پر کافور ہو جاتا۔

معراج شریف اور عرسوں کے اجتماعات جب آہستہ آہستہ اپنی جسامت بڑھانا شروع کرتے تو پُرانی مانوس و آشنا بزرگ صورتوں کا ورو بڑا دلفریب ہوتا ایک تزیینہ مہر دیوں میں غالباً اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کے عرس مبارک کا موقع تھا۔ والدِ محترم ناشتہ سے فارغ ہو کر شیش محل کی شرقی دیوار کے ساتھ بڑے کاؤچ پر تشریف فرما تھے۔ میں نے جب مہانوں کو ڈیوڑھی کے صدر دروازہ سے گروہ در گروہ اندر داخل ہوتے دیکھا تو طبیعت محل گئی اور فیصلہ کر لیا کہ آج سکول نہیں جاؤں گا۔ آہستہ سے شیش محل میں داخل ہوا اور خاموشی سے پلنگ کے ساتھ لگا کر بیٹھ گیا۔ مہانوں کی آمد جاری تھی۔ سب لوگ ذوق دیدار سے سرمست و سرشار داخل ہوتے اور روایتی طریق سے جھک کر سلام پیش کرتے اور خاموشی سے ہٹ کر دوزانو بیٹھ جاتے۔ متبرک نشست گاہ تقریباً بھر چکی تھی کہ اتنے میں اتھائی سادہ اور کھد میں ملبوس فقیر کرم دین پھپھرا (پیر پھلا ہی) بھی سبحان اللہ سبحان اللہ کی گردان کرتے ہوئے مع ایک عدد ڈانگ داخل ہو پڑا۔ ڈانگ تو خیر فقیر صاحب نے دروازہ کے ساتھ لگا کر رکھ دی لیکن خود اسی عالم بے خودی میں شیش محل میں داخل ہو کر والدِ محترم تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ فقیر صاحب موصوف سے ابھی لوگ زیادہ آشنا نہیں تھے۔ ان کی سبحان اللہ سبحان اللہ کی بے تکلف گردان لباس کی بے اتھاسادگی جن کی صفائی نہ ہونے کے برابر تھی، سے حاضرین

جلس چوتک سے پڑے اور اس جسارت پر حیرت و استعجاب کے جذبات ان کے چہرے
 پر ابھرائے۔ فقیر صاحب جب والدِ محترم کے قدموں کی طرف جھکے تو انہوں نے ہاتھ
 آگے بڑھا کر انہیں اُوپر اٹھالیا اور دیر تک گلے سے لگائے رکھا۔ بڑے بڑے
 صاحبِ حیثیت لوگ معطر لیا سوں میں ملبوس دور بیٹھے اس خلاف توقع منظر میں
 جذب ہو کر رہ گئے۔

بہ متابع خود چہ تازی کہ بہ شہرِ در و منڈال
 دلِ غزنوی نہ نیرزد بہ تلبستھے ایازے

شیش محل

شیش محل ایک رنگین، منقش اور فیضان و برکت سے بھر پور نشست گاہ تھی جسے ثانی حضرت قدس سرہ العزیز نے تعمیر کروایا۔ یہ ایک ”مال“ تھا جس کی دیواروں پر بڑے خوبصورت نقش و نگار مستری حبیب صاحب مغفور نے ۱۲۱۳ھ کے لگ بھگ بنائے تھے۔ دیواروں پر بڑے موزوں اشعار لکھے ہوئے تھے مثلاً

یارب تو کریمی و رسول تو کریم

صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

چھت کی نقوش سے بھر پور سُرخ تخت بندی ایسی تھی کہ فن کار کی مہارت ہر آنے والے سے خراج تحسین وصول کرتی۔ چھت میں گول آئینے اس تزئین و آرائش کے ساتھ چڑے ہوئے تھے کہ یہ ساری عمارت مغلیہ دور کی کوئی نہایت پر تکلف یادگار معلوم ہوتی۔ فرش پر مختلف قالین چکھے تھے دو باریاں مسجد کی طرف کھلتی تھیں۔ والدِ محترم مشرقی باری کے ساتھ قالین پر گاؤتکیہ لگا کر بیٹھتے۔

حافظ محمد قاسم ازبجیٹھل کی روایت کے مطابق حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ از چاچہ شریف (تحصیل شاہ پور) جو ثالت حضرت کے ”پگ بھائی“ تھے، نے اسی شیش محل میں باقاعدہ سازندوں کی موسیقی پر قوالی سنی۔ حضرت قلندر حضرت ثالت

سے خصوصی تعلق کی بنا پر والدِ محترم سے بے حد پیار کرتے۔ والدِ محترم تو اس قوالی کے دوران میں احتراماً بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ البتہ خلفاء اور دیگر مریدین نے اس خلاف معمول ”مخفل موسیقی“ پر سخت صدائے احتجاج بلند کی۔ بقول حافظ صاحب موصوف میری عمر اُس وقت تقریباً چار سال تھی اور میں اس مخفل موسیقی میں خوب اچھلتا کودتا رہا اور اس طرح گویا قوالوں کے فن کی داد دیتا رہا۔ مجھے حضرت قلندر نے گود میں اٹھالیا اور پیار کیا۔ لیکن اکابر مریدین کا اس ”چشتیانہ جسارت“ پر احتجاج زور پکڑتا گیا کہ نقشبندیوں کے اس متبرک مقام پر یہ طوفانِ بدعت، والدِ محترم تو بالکل خاموش تھے حضرت قلندر نے جب دیکھا کہ سجادہ نشین صاحب کے گرد گھیراؤ تنگ ہو رہا ہے تو بڑے وقار سے معترضین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ بزرگو! ناراض کیوں ہوتے ہو؟ اگر ایک گنا مسجد کے صحن میں ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل جائے تو کیا اس سے مسجد پلید ہو جائیگی؟ بقول حافظ صاحب اس ”عارفانہ انکسار“ پر لوگ نار و قطار رو پڑے اور یہ موضوع ختم ہو گیا۔

حضرت قلندر حضرت شمس العارفین سیال شریف کے حلقے مجاز میں سے تھے۔ ثالث حضرت قدس سرہ العزیز سے خصوصی تعلق کی بنا پر والدِ محترم کی شادی پر انہیں دعوت نامہ بھیجا گیا تو اپنے لاؤ لشکر سمیت تشریف لائے۔ گاؤں سے باہر پڑاؤ ڈالا۔ تمبوقتائیں وہ اپنے ساتھ لائے تھے انہیں شہر میں آنے کے لئے جب درخواست کی گئی تو فرمایا کہ دعوت نامہ صرف میرے لئے تھا میرے لشکر کے لئے نہیں لہذا میں خود کفیل ہو کر آیا ہوں ان کے ہمراہ قوالوں کی جماعت بھی تھی۔ انہیں عرض کیا گیا کہ قوالی یہاں نہ کریں تو ناراض ہوئے اور اس موقع پر اپنے انداز میں ہر قسم کے شادی نے بجانے پر اصرار فرمایا اس لئے کہ یہ ان کے یتیم بھتیجا کی شادی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں بزرگوں کے احترام

کی وجہ سے بازار بڑا ورنہ میں تو کنجریاں نچانے کا پروگرام رکھتا تھا۔
پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرے صحبت نہیں رہی

کچھ عرصہ بعد مولینا رشید احمد اچانک رخصت ہوئے تو مدرسہ کی زندگی بالکل
بے کیف ہو کر رہ گئی۔ گویا۔ ط

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

لیکن اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کی اس کشادہ اور پُر سکون مسیحا کا زیادہ
عرصہ کے لئے رونق ہونا بھی غیر ممکن سی بات تھی۔ چنانچہ قدرت نے ایک ایسے
نیک سیرت سراپا مروت اور درویش صفت انسان کو اس منصب کیلئے منتخب
فرمایا کہ خدمت و ایثار کے پچھلے تمام ریکارڈ مات ہو گئے۔ جناب صوفی احمد خان صاحب
جن کا تعلق بھیرہ کے نواحی گاؤں ”گوہلی“ سے ہے بھلا وال ہائی سکول سے نہایت امتیازی
شان کے ساتھ میٹرک پاس کر کے چند اجاب کے ساتھ والد محترم کی خدمت میں حاضر
ہوئے۔ ملاقات کے دوران غالباً والد محترم نے انہیں دینی تعلیم کے حصول کی تلقین فرمائی
اور اس کے ساتھ میری یعنی راقم الحروف کی انگریزی تعلیم میں رہنمائی کے لئے کہا۔ صوفی صاحب
ذہین و فطین نوجوان تھے اور مستقبل کے اُفق پر اپنے شاندار کیریئر کو بڑی شفاف صورت
میں دیکھ رہے تھے لیکن اس فرمائش پر برسرِ تسلیم خم کر دیا۔

بمہ سرمایہ خود را بہ نگاہے بد ہند

ایں چہ قومیت کہ سودا بنیاں نیز کنند

لطفِ دعائے سحرگیا

جناب صوفی صاحب موصوف کی اس مدرسہ میں آمد و راصل موجودہ دور کا ایک اہم واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ صوفی صاحب نے ابتداً ایک طالب علم کی حیثیت سے کی اور مولانا شیر الرحمن صاحب اور مولانا حکمت شاہ صاحب سے جو مولانا رشید احمد صاحب کے فوراً بعد گئے تھے۔ کچھ تلمذ بھی کیا۔ لیکن اپنی میرٹ انگیز استعداد کی بدولت وہ بہت جلد خود معلم بن گئے اور معلم بھی اس شان کے ساتھ کہ انہوں نے خالقانہ شریف پر درس نظامی کے استاد کی حیثیت سے غالباً طویل ترین عرصہ گزارا۔

پانچویں جماعت سے نڈل کلاسوں کا آغاز ہوا تو یہ ماحول نسبتاً بہتر محسوس ہونے لگا۔ یہ سکول کی عمارت کے انتہائی مشرقی حصہ کا آخری جنوبی کمرہ تھا۔ تعجب ہوا کہ اس میں ڈیسک بھی تھے جن پر بیٹھنے سے مٹی اور دھول سے وہ بے تکلفی ختم ہو گئی جو پچھلے چار سالوں سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ قائم تھی۔ اس کمرہ سے ملحقہ لادہ بھروانہ کے لئے اب ضمیریں کی بہم رسانی کے ضمن میں ٹوٹیاں لگائی گئی تھیں۔ شہر کی مستویات یہاں سے پانی بھرتیں۔ ہندوؤں کے لئے دو ٹوٹیاں الگ تھیں۔ یہاں سارا سارا دن اونچی اونچی آواز میں لڑنے بھرنے والی عورتوں کا ہجوم رہتا اور غزل، اور جواب آں غزل کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہونے پاتا۔ دراصل یہ ہمارے گاؤں کا پنگھٹ، تھا بعد میں جب میں نے

پنگھٹ کے بارے میں شاعروں کے رومان پرور خیالات سننے مثلاً

پنگھٹ پر مُسرتیا باجے

بہت کٹھن ہے ڈگری پنگھٹ کی

پنگھٹ پر سکھین کے سنگ جب پتیا بھرن کو جاؤں

چھلک پڑے نین کی لگری رورونیر بہاؤں

تو میرا ذہن اس پنگھٹ کی طرف منتقل ہو جاتا۔ جہاں رومان نام کی تو کوئی چیز نہ

تھی البتہ اس لحاظ سے کٹھن ضرور تھا کہ اپنی جان بچا کر ویاں سے بخیریت واپس آنا واقعی

ایک کارنامہ سمجھا جاتا۔

پانچویں جماعت میں انگریزی سے متعارف ہوا تو جناب صوفی صاحب نے

انگریزی حسی نامانوس اور نامعقول زبان سے ایسا دلنشین تعارف کرایا کہ اس کی

اجنبیت و غیریت ختم ہو کر رہ گئی۔ یہاں سے ہی میری طالب علمی کے اس دور کا آغاز

ہوتا ہے جو بڑا دلفریب بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ نہایت ہی جانفزا اور خوش آئند

کیونکہ یہی وہ نقطہ آغاز ہے جہاں سے میرے شعور و دانش کے دورِ افق پر ایک

مختصر سا گول دائرہ بتدریج وسعت پذیر ہونا شروع ہوا۔ لیکن یہ وسعت جہاں ایک

مبارک ابتداء تھی وہاں مجھے کیفیات و محسوسات کی دنیا کے ان معصوم تصورات سے

محروم بھی کرتی چلی گئی جو آج تک میری یادداشتوں کا ناقابل فراموش حصہ ہیں اور جن کی

بدولت ہے

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی

تبسمِ فشاںِ زندگی کی کلی تھی

فرشتے سکھاتے تھے شبینم کو رونا
 ہنسی گل کو پہلے پہل آرہی تھی
 یہاں تک کہ کسی گھنے درخت پر چھپ کر گلنے والی فاختہ کی ”گھگھو گھوہ“ دینا
 اور ما قیہا سے بیگانہ کر دینے کے لئے کافی تھی اور شام کے اُداس دھند لکوں میں پرندوں
 کے غول اپنی پناہ گاہوں کی طرف اڑ کر جانے لگتے تو مجھے یوں لگتا جیسے یہ ہم سے ناراض ہو کر
 نامعلوم منزل کی طرف اڑے جا رہے ہیں اور شاید اب کبھی لوٹ کر واپس نہ آئیں۔
 بہر حال ہے

ہنستا ہوں یوں کہ بھر کی راتیں گزر گئیں
 رقتا ہوں یوں کہ لطفِ دُعلئے سحر گیا
 ”کریما“ اور ”پند نامہ عطار“ تو پہلے ہی ختم کر لئے تھے۔ صوفی صاحب سے گلستانِ سعدی
 شروع کی تو ذہنی خلاؤ کے اُس دور میں پڑھا ہے
 گلِ خوشبوئے در حمامِ روزے
 رسید از دستِ محبوبے بدستم
 بدو گفتم کہ مُشکی یا عنبیری؟
 کہ از بوئے دلاؤیرے تو مستم
 بگفتا من گلِ ناچیز بودم
 ولین مدّتِ با گلِ نشتم
 جمالِ ہم نشین در من اثر کرد
 وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یہاں سے تھوڑا آگے نکلے تھے کہ ایک جھٹکا اور لگا۔

اے مرغِ سحر عشقِ زہد پر وانہ بیا موز

کین سوختہ را جاں شد آواز نیامد

ایں مدعیانِ در طلبش بے خبر اند

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

چونکہ ذہن کی سلیٹ صاف و شفاف تھی لہذا حضرت سعدی علیہ الرحمۃ

کے یہ نقش و نگار ویاں مستقل طور پر منعکس ہو گئے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ شیراز

(ایران) میں غالباً ۵۸۹ ہجری (۱۱۹۳ء) کو پیدا ہوئے۔ اپنی عمر کی سینچری بنانے

کے بعد ۶۹۱ ہجری میں وفات پائی۔ سینچری، تو شاہد اور بزرگوں نے بھی

بنائی ہوگی لیکن جو چین، گلستان، اور بوستان، کی شکل میں شیخ علیہ الرحمۃ نے کھلائے

ان کی ہر ایک زمانہ کو معطر کر گئی۔

صوفی صاحب نے مجھے نماز کی طرف راغب کیا اور اس میں باقاعدگی کی بڑی

دلنشین تاکید فرمائی۔ ان کے عظیم احسانات میں سے ایک یہ بھی ہے۔

انہی دنوں ثالث حضرت قدس سرہ العزیز کے ایک مرید باصفا جناب سالم

صاحب والد محترم سے اجازت پا کر ہمیں گھر و سواری کی تربیت دیتے تھے صوفی صاحب

سے چھٹی لے کر بعد از نماز عصر رمضان والے رپڑ، (میدان) میں یہ ٹریننگ شروع

ہوتی۔ جناب سالم صاحب اپنی نگرانی میں ہمیں سوار کر کے دو گول دائروں میں

چکر لگانے کا حکم دیتے۔ یہ ”دائرہ بالا“ آخر انگریزی میں آٹھ کا ہندسہ نظر آنے لگتا۔

میں شروع شروع میں ہنگامی صورت حال سے نپٹنے کے لئے زمین پکڑ لیا کرتا۔ اس

غلطی کو سالم صاحب نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ وہ فرماتے کہ صرف لگام سے اپنا توازن قائم رکھو۔ اسی تربیت کے دوران میں ہم نے کلمہ مارنا بھی سیکھا۔ ایک سیدھی لائن تھی جو بولیا نوالہ سے شروع ہو کر رمضان والے پڑے کو چیرتی ہوئی ہمارے بندہ کی سرحد تک پہنچتی۔ اس پر گھوڑے سر پیٹ دوڑتے۔ سب سے زیادہ تیز دھیمی اور خوبصورت دوڑ والد محترم کی عربی النسل سرخ گھوڑی کی تھی۔ پہلے پہل میں نے اسی گھوڑی کو والد محترم کے پاس دیکھا۔ علی الصبح جب اس موزوں قامت اور سبک رفتار گھوڑی پر جب والد محترم سیر کو نکلنے تو راکب و مرکب کی شان ہی نرالی ہوتی۔ یہ گھوڑی اچانک مر گئی تو مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ اس کے بعد کئی گھوڑے لائے اور گئے لیکن کوئی اس کا بدل نہ بن سکا۔ بانو دھریانی کا ایک قد آور گھوڑا البتہ اس کی جگہ لینے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا۔

سالم صاحب نے تربیت کا مقدمہ حصہ اسی پر مکمل کر دیا۔ اب کلمہ مارنے کی طویل مشقیں اسی پر کی جاتیں۔ سرخ رنگ کا یہ خوبصورت جانور غیر معمول حد تک زور آور اور شوخ و شنگ تھا اور سوار کے لئے اسے سنبھالنا ایک مسئلہ بن جاتا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۵۱ء میں جناب عبدالقدوس صاحب ہاشمی (ماموں جان) کی بات جب رتہ شریف سے بھون کے لئے روانہ ہوئی تو کوئی بھی اسے سواری کے لئے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ بالآخر 'قریبہ فال بنا ہر من دیلانہ زوندہ دراصل اُس نے اپنی جوانی ایک ایسے سوار کی خدمت میں بسر کی تھی جس کی شوکت و مکنیت سے زمانہ کی رفتار تھم جایا کرتی۔ لہذا یہ اس کی عادت سی بن گئی کہ سب گھوڑوں سے آگے نکل کر چلتا۔ بات میں سب سے کم سن سوار میں تھا۔ اس گستاخی کا متحمل ہونا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ رتہ شریف سے بھون پہنچتے پہنچتے

اُس نے میرا بُرا حال کر دیا۔

اس کی بعض عادات اتنی غیر معمولی تھیں کہ اُن کا تذکرہ کئے بغیر میں اُگے نہیں بڑھ سکتا وہ بے حد غیور اور خود دار تھا اور اُٹھو لوں پر کوئی سودا بازی نہ کرتا۔ یہ غالباً ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے کہ بھیرہ کے میراں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متوفی جناب امیر سلطان صاحب المعروف سائیں صاحب شکار کھیلنے بلکہ شریف آئے۔ اُن کے ساتھ ان کا لاڈلے شکرہ باز اور گھوڑے بھی تھے۔ جب حویلی (نئے مکانوں) میں داخل ہوئے تو سائیں صاحب کے موٹے تازے گھوڑے نے اچانک اُتار دیا کہ اس پر دو لٹیوں کی بارش برسا دی اور وہ شور مچایا کہ اللہ تیری پناہ۔ یہ بے چارہ پابندِ سلاسل تھا۔ صحیح طور پر اپنا دفاع بھی نہ کر سکا۔ شکاری حضرات دوسرے روز شکار کھیلنے نکل گئے اور اپنا گھوڑا بھی ساتھ ہی لے گئے۔ اسے مزید جکڑ دیا گیا تھا کہ کوئی قساذ نہ کھڑا کر دے۔ بالآخر ایک روز علی الصبح جب شکاری قافلہ رخصت ہو رہا تھا اور اپنے ساز و سامان سمیت حویلی سے لکھنے ہی والا تھا کہ اس نے ایک زبردست جھٹکے سے ”سنگلی“ توڑی اور صدر دروازہ سے نکلے ہوئے اپنے حریف کو گردن سے دیوچ کر اس زور سے اچھالا اور پھر اس قدر زور سے زمین پر پٹخا کہ مہمان حضرات اور انہیں الوداع کہنے والوں نے بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں پھر اُسے بار بار زمین پر پٹخا یہاں تک کہ وہ بے حال ہو گیا۔

بالکل ایسی ہی ناروا اور ناجائز زیادتی پر سون سکیس میں کھکی کے ایک گھوڑے کو اتنی سزا دی کہ وہ مرتے مرتے بچا۔ ہم سب بھائیوں کے لئے سریش دوڑ کے میدان میں اُسے قابو رکھنا خاصا دشوار کام ہوتا۔ سالم صاحب بھی اس سے محتاط رہتے۔ البتہ والد محترم کے ساتھ وہ خود بڑا محتاط تھا اور پوری سعادت مندی کے ساتھ حکم بجالاتا۔ یہ عجیب

بات ہے کہ اُن کی وفات پر اکثر لوگوں نے اسے زار و قطار روتے اور ٹپ ٹپ آنسو بہاتے دیکھا۔ میرے ذاتی مشاہدہ میں بھی آیا کہ پرنے ریلوے اسٹیشن پر جب میں اُسے لے جانا کہ تو والدِ محترم کے فراق اور ملاقات کے شوق میں خوب اُچھلتا اور کلکلیس کرتا ہوا چلتا۔ کیونکہ ریلوے اسٹیشن سے گھر وہ گھوٹے پر ہی تشریف لاتے تھے۔ لیکن جب گاڑی رکتی اور مسافروں کی بھیر اُدھر اُدھر چھٹ جاتی تو اتنا مایوس اور دلگیر ہوتا کہ قدم اٹھاتے ہوئے اُسے بڑی مشکل پیش آتی اور بڑی ہی سُست روی کے ساتھ چلتا ہوا گھر پہنچتا۔ پھر کھڑی پر اُداس کھڑا مسلسل آنسو پکاتا رہتا۔ وہ دماغی ایک ایسا تبرک تھا جسے سنبھال کر رکھنا ہماری قسمتوں سے دُور بات تھی۔ وہ اب بوڑھا بھی ہو چکا تھا اور شانہ زور اور بھی اتنا نہ رہا ہو۔ بہر حال ہم نے اُسے ایک نوجوان سفید گھوڑے کے عوض غالباً پچالیہ کے کسی تانگہ بان کے حوالے کر دیا۔

کہن شاخ کہ زیر سایہ اوپر برآوردی

چو بگوش ریخت ازوے آفتیاں برداشتن ننگ است

زندگی میں جو شروع اُس نے دیکھا اور اپنے سوار کے حوالہ سے عزت و احترام کا جو

خروج وہ وصول کر چکا تھا اس کے بعد یہاں زندہ رہنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

تانگہ بان نے جب اُسے تانگہ کے سامنے جوتا تو کھڑے کھڑے اس کی روح قفسِ عنبری

سے پر فاز کر گئی۔ ع

یہ جان تو اُنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

ایام تحریک آزادی

گھڑ سواری کی تربیت وقفوں کے ساتھ کافی عرصہ تک جاری رہی۔ اس سے صحیح طور پر بہرہ ور ہونے والے برادر عزیز محمد صبغتہ اللہ صاحب اور دوسرے نمبر پر جناب بھائی صاحب تھے۔ میں تیسرے نمبر پر تھا۔ جناب امالیق محمد سالم صاحب سے یہ خصوصی تعلق تاحیات قائم رہا۔ وہ ثالث حضرت قدس سرہ العزیز کے عرس مبارک (سات رمضان المبارک) کو جب اللہ شریف پہنچتے تو پرانی یادوں کے گلشن بہتے لگتے۔

استاد اورنگ زیب صاحب کی جگہ اب جناب استاد فیض محمد صاحب مغفور (نہیں ضلع گجرات) لے چکے تھے۔ گویا اب پھر دونوں شعبوں نے کام شروع کر دیا یعنی حفظ قرآن پاک اور درس نظامی۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کے مبارک دور کے بعد یہ دور غالباً مبارک ترین مقصور ہو گا۔ ایک طرف صوفی صاحب جیسا بے لوث اور منکسر المزاج عالم تدریس کے منصب پر فائز ہو گیا تو دوسری طرف استاد فیض محمد صاحب نے پیکر ایثار و اخلاص کی حیثیت میں حفظ قرآن کریم کی تدریس کے فرائض سنبھال لئے۔ چنانچہ اسی مقام پر آہستہ آہستہ وہ رونقیں جو استاد رشید احمد صاحب کے زمانہ میں ہم نے پہلے پہل دیکھی تھیں لوٹ آئیں۔

ایک دفعہ مکمل چان بھان کے بعد جمود ٹوٹنے کی ابتداء ہوئی تو صوفی کرم بخش صاحب (جموں) اور غلام نبی (لاٹپور) بارش کے پہلے قطرہ کے طور پر ٹپکے مولوی محمد فاضل صاحب جو بعد میں فرقہ واریت میں ملوث ہونے کے سبب اعتدال و توازن کی نعمت سے محروم ایک اچھوت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے بھی السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ میں سے تھے۔ اس کے بعد تو اضافہ روز افزوں بھی تھا اور روح افزا بھی۔ محمد لطیف، غلام رسول، محمد بخش از چکوڑہ کا نام بھی اولیت ہی کی بنا پر نہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ استاد فیض محمد صاحب بڑے مہربان اور شفیق آتالیق تھے ان میں ایک روایتی استاد کا سار کھار کھاؤ بالکل نہیں تھا لیکن اپنے منصب سے وہ عشق رکھتے تھے۔ چنانچہ مسجد خاتقاہ شریف ایک بار پھر تلاوت قرآن پاک کی صلاؤں سے گونجنے لگی اور حق تو یہ ہے کہ خلوص تبت ہی کا یہ ثمر تھا کہ اس مسند پر وہ تقریباً تیس سال مسلسل فائز رہے اور آج بھی یہ منصب انہی کے شاگردوں کے پاس چلا آتا ہے۔

پچھلی جماعت میں ہمارے کلاس ٹیچر منشی محمد دین صاحب پھپھرہ تھے۔ انہوں نے ماحول کو ہمیشہ غیر رسمی انداز میں درست رکھا۔ بالکل کھلے ذہن اور رحم دل بھی۔ چنانچہ یہ سال ان کی شفقت اور مہربانی سے کسی ذہنی دباؤ کے بغیر گزر گیا۔ سکول کے بعد ڈنگ ہاؤس سے متصل ان کی چوڑے کی بھٹیاں تھیں۔ اسی زمانہ میں انہوں نے جہانوں کے لئے ایک قیام گاہ تعمیر کروائی اور یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ہماری کلاس نے اس تعمیر میں اینٹیں ڈھونے کی خدمت سرانجام دی۔ جس روز وہ ہم سے یہ خدمت لیتے ہماری گویا عید ہو جاتی۔

اسی سال یعنی ۱۹۴۲ء میں والدِ محترم لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ جب واپس

پہنچے تو ایک برطانوی نژاد صاحبِ ریش نوجوان ان کے ہمراہ تھا۔ اُسے باہر
 نو تعمیر شدہ بنگلہ کے مشرقی کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ انگریز نوجوان اگرچہ قبولِ اسلام کے
 شرف سے مشرف ہو چکا تھا لیکن یورپیت اس میں بدرجہہ اتم موجود تھی تاہم وہ
 زیادہ تر وقت والدِ محترم کے پاس خاموش بیٹھ کر گزارتا۔ ایک روز والدِ محترم کی
 فرمائش پر اُس نے شیش محل میں جمع لوگوں سے خطاب بھی کیا۔ تقریر اس کی مادری زبان
 میں تھی مترجم کے فرائض البتہ جناب صدیقی احمد خان صاحب نے سرانجام دیئے تھے۔
 یہ لکچر اسلام کی افاقیت اور عام پسند و نصائح پر مشتمل تھا۔

یہ کیا معنی تھا اور یہ تو مسلم انگریز یہاں کیسے آگیا اس کی تفصیل میاں الہ دین
 صاحب مرحوم کھیڑنے نے اس طرح سے بیان کی کہ ”حضرت صاحب عرس مبارک
 حضرت مجددِ عالم ثانی امامِ ربّانی قدس سرّہ العزیز کی تقریباتِ بابرکات سے فارغ
 ہو کر سریند شریف سے سیاحت کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ جو چند شہر کا
 آپ کے ہمراہ تھے ان میں میاں الہ دین صاحب بھی تھے۔ بہر حال یہ نیا کہ حسبِ
 پروگرام صوبہ جات متحدہ کے مشرقی روایات کے حامل حسین و جمیل شہر میں پہنچ گیا۔
 سیر و سیاحت کے مختلف پروگرام چلتے رہے۔ ایک روز حضرت صاحب لکھنؤ
 فیشن کی پرتکلف ٹم ٹم میں سولہ بازار سے گزر پڑے۔ بقول میاں الہ دین صاحب
 جو بھی دیکھتا حیرت کی تصویر بن کر دیکھتا ہی رہ جاتا۔ سبحان اللہ! لکھنؤ کے خوش ذوق و
 خوش لباس لوگ ایک طرف اس منظر میں گویا سما سے گئے تو دوسری طرف حضرت صاحب
 ”صفتِ مہتمم کے گزشتہ برستارہ کے مہدق گرو پیش سے بے نیار آگے بڑھ

رہے تھے کہ اچانک ایک نوجوان فرنگی نے ایک طرف سے آگے بڑھ کر ٹم ٹم کو روک لیا۔
 چند لمحوں کے لئے جیسے وہ بُت بن گیا ہو۔ پھر اچانک پاؤں پر گہرا اور زارو قطار روپڑا
 اور اسلام قبول کرنے کا شرف اُس کا مقدر بن گیا۔ انگریز نوجوان نے بعد میں
 اس اجمال کی جو تفصیل بیان کی وہ کچھ یوں ہے:

”میں ایک انگریز نوجوان تھا اور اپنی مذہبی رسوم کا احترام
 کرنے والا ملازمت کے ضمن میں مجھے ہندوستان آنا پڑا۔
 ایک رات میں حسبِ معمول اپنی قیام گاہ میں نیند کے لئے
 مخصوص کمرہ میں سو گیا۔ خواب میں ایک مسلمان بزرگ سے
 ملاقات ہوئی۔ میں اُس بزرگ کی وجاہت و جلال سے اس
 قدر مرتعوب ہوا کہ بے اختیار مسلمان ہونے کی درخواست کر دی
 اُس جملہ نے مجھے مشرف بہ اسلام کیا اور میں بیدار ہو گیا۔
 عالم بیداری میں بھی اس مخصوص کیف کو بدستور محسوس کرتا
 رہا۔ اس کے بعد عجیب بے قراری سی محسوس ہونے لگی۔
 یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد پھر وہی منظر خواب میں دیکھا۔
 اب تو حالت یہ ہو گئی کہ میں سراپا جلال و جمال کا تصور
 لئے دنیا و مافیہا سے بیگانہ رہنے لگا۔ ہندوستان کے اکثر
 ڈپٹی کمشنروں کو قلمی تصویر کے حوالہ سے اُس بزرگ کا نام و
 نشان بتانے کی درخواستیں کیں مگر بے سود۔ میری مایوسی
 میرے قومی کو مضمحل کئے دے رہی تھی اور میں زبردست

تفصیاتی کشمکش میں مبتلا تھا کہ قدرت نے اُس کو ہر مراد کو ڈرامائی

انداز میں عین میری نگاہوں کے سامنے لا کر رکھ دیا۔“

لہ شریف میں اُس نے تقریباً پندرہ بیس دن گزارے۔ اُس کا قیام نئے
بنگلہ میں تھا جو والدِ محترم نے گھر کی جگہ اتہائی مختصراً کر ۳۸-۶۱۹۳۷ میں مستری فتح محمد
صاحب بھلووال کی نگرانی میں تعمیر کروایا پھر ۶۱۹۵۶ میں پورا گھر ہی یہاں منتقل ہو گیا۔
وہ والدِ محترم کا بے حد عاشق تھا یہ نو میر کا آخری عشرہ تھا۔ میں عیدِ قربان پر اس کی خیریت
پوچھنے گیا تو اُس نے حسبِ معمول ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا ”ہم..... بہت کھایا۔“ اس پر
حاجی میاں محمد مرزا صاحب جو پاس کھڑے تھے فوراً بول پڑے۔ ”ہم نے بھی بہت
رج کے کھا دھا۔“ ایک دن وہ رخصت ہو گیا۔ شیلانگ سے اُس کے خطوط والدِ محترم
کے نام آتے رہے۔ صوفی احمد خان صاحب ببارت کا ترجمہ کر کے خط سنا تے۔

ساتویں جماعت میں اب ہم جماعت ساتھیوں سے کچھ کچھ لگانگت کا احساس
پیدا ہونا شروع ہوا۔ اس کلاس کے ٹیچر انچارج جناب ملک فیروز خان تھے جو بڑے
مختی اور لگن سے پڑھانے والے استادوں میں تھے۔ وہ بڑے اُتھک اور تسلسل
سے پڑھانے والے تھے اور علی الصبح ہی بالکل کمپیوٹر کی طرح ایک خاص انداز سے
پڑھائی شروع کر دیتے۔ مقرر شدہ کوڑے کے مطابق بلا استثناء سزا دیتے اور ایک سوٹی
کی ضربیں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر مارتے جاتے۔ ان کی جماعت میں ہمیں پہلی دفعہ
”باقاعدگی“ کے مفہوم کو سمجھنے کا موقع ملا۔

اٹھویں جماعت اس سکول کی آخری جماعت تھی۔ اس کے استاد جناب
مولوی محمد امین صاحب تھے۔ وزیریکلر فائنل کے امتحان کا ایک اُنجانا سا خوف

سوار رہنے لگا۔ مولوی صاحب اس کی اہمیت کے پیش نظر شروع سال ہی سے بڑی لگن سے پڑھانا شروع کر دیتے۔ ہمارا مانیٹر گاؤں کے ایک معروف سنار ہیرا لعل کاپیٹا سری رام تھا۔ تمام مضامین مولوی صاحب خود پڑھاتے البتہ انگریزی وہ نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اس سکول کے انتہائی شریف النفس اور معزز ہندو ہیڈ ماسٹر لالہ جی ہتھارام انگریزی کاپی رڈ لیتے۔ وہ بڑے قابل اور انگریزی کے مانے ہوئے استاد تھے۔ سختی بالکل نڈار اس کے باوجود نظم و ضبط برقرار رہتا۔ انگریزی میں بڑے بڑے خوبصورت ٹیچر ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتے۔ ایک دفعہ ہندو نصائح کے دوران ان کی زبان سے نکلا۔ ”سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں“ تو کوئی طالب علم بول اٹھا اس کو انگریزی میں کیسے ادا کریں گے تو فرمانے لگے۔

“BLISS IS SHORT LIVED”

یہ وہ دن تھے جب غیر ملکی حکمرانوں سے نجات کا مسئلہ پورے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس واضح طور پر اپنا پسو گرام پیش کر چکی تھیں۔ ”مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ“ قائد اعظم کا پیغام عامۃ المسلمین کو مسجور کر چکا تھا۔ چونکہ ہمارا گاؤں مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ ہندو آبادی زیادہ مستعد و متحرک نظر نہ آتی۔ چنانچہ ایک صبح جناب ہیڈ ماسٹر صاحب کے بیٹے کے سینے پر ”ہند“ کا بیج دیکھا تو میں اس اصطلاح سے بہت حیران ہوا۔ معلوم ہوا کہ ”ہے کے رہیں گے پاکستان“ ”ہن کے رہے گا پاکستان“ کا یہ ایک جواں نعرہ ہے۔

انہی دنوں اسلامیہ کالج لاہور کے طالب علموں کا ایک وفد حافظ سلطان بخش صاحب ولد میاں امیر بخش صاحب مغفور (لہہ ہندوانہ) کی قیادت میں گاؤں آیا۔

وفد سیدھا والد محترم کے پاس پہنچا اور اپنے تبلیغی پروگرام کا خاکہ پیش کیا۔ والد محترم نے خوش ہو کر میری بانی کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ وفد کا تبلیغی پروگرام کیا تھا۔ دن کو مختلف مساجد میں دو قومی نظریہ پر مبنی پاکستان کی ضرورت و اہمیت بیان کرنا اور رات کو دیر تک ٹولوں کی شکل میں مسلم لیگ کا منظوم دستور بڑی دلکش آوازوں میں گلی کوچوں کے اندر بصورت ڈکوریس، گاتے پھیرنا ان کی سادہ اور پرسوز ہے میں وہ جادو ہوتا کہ اللہ تیری پناہ۔ گاؤں کے سادہ نقش لوگوں کے لئے یہ نسخہ واقعی تیر بہدف ثابت ہوا ورنہ بعض گوشے بڑے موثر انداز میں گاندھی کی ”درویشی“ اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی سیاست کے حق میں رطب اللسان تھے اور مولینا ابوالکلام آزاد کے علمی تفوق کے حوالے سے سادہ لوح دیہاتیوں کو دو قومی نظریہ سے یکسر بے خبر رکھنے کی کوشش میں مصروف۔

انہی ہنگاموں کے دوران جو بڑے ایمان افروز اور ولولہ انگیز تھے۔ حکومت ہند نے عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ انہی انتخابات کے نتائج کے طور پر جے ہند اور ”پاکستان“ کا فیصلہ ہونا تھا۔ انتخابی مہم آہستہ آہستہ اپنا مزاج گرم کرتی گئی۔ بلاجہ غضنفر علی خان مسلم لیگ کے امیدوار تھے تو ایک اور بلاجہ صاحب غالب آباد بھڑا بھڑا یونینسٹ پارٹی کے نامزد جس کے عشور کا خلاصہ تھا

در دیر نیاز من در کعبہ نماز من

زتا بدوشم من تسبیح بدستم من

غالباً یہ کانگریس ہی کی کوئی ذیلی شاخ تھی کیونکہ قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے

آقائی پروگرام کو سبوتاژ کرنا اس کا اصل مشن تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مسجد میں والد محترم

نے معززین شہر کو بلا کر ان سے ہمہ لیا کہ وہ اپنی رائے مسلمانوں کے اجتماعی

مفاد (مسلم لیگ) کے حق میں استعمال کریں گے اور پھر ان سب حضرات کو اپنے
 برادرِ اصغر جناب عم محترم کی زیر سرکردگی ووٹ ڈالنے کے لئے ڈھڈھی شریف
 روانہ کیا جہاں پولنگ بوتھ بنایا گیا تھا۔

اس ضمن میں ایک ووڈ چسپ واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ انتخابی ہم
 کی کہا گئی کے دوران میں یونیورسٹی بھی والد محترم کے پاس آئے اور اپنے لئے
 تائید و امداد کی درخواست کی والد محترم بالکل خاموش رہے۔ یہ ملاقات عصر کے
 وقت اوپر بنکر باہر پھپھروں کے کوٹھے سے متصل کھلی چھت پر ہوئی۔ والد محترم
 نے اوپر کوٹ پہن رکھا تھا۔ بوقت رخصت سربراہ وفد نے مصافحہ کے وقت
 نوٹوں کی دتھیاں اوپر کوٹ کی دائیں بیرونی جیب میں ڈال دیں۔ کچھ دیر بعد جیب
 والد محترم نے ہاتھ جیب میں ڈالا تو ٹھٹھک سے گئے۔ نوٹوں کو جیب سے نکالا اور
 حیرت و استعجاب سے ان کو دیکھنے لگے۔ ساتھ ہی چہرہ کارنگ بدلتا جا رہا تھا۔ بغیر کچھ
 کہے انہوں نے رقم کو پھپھروں کے صحن میں اچھال دیا۔ افسوس کہ اُس وقت تک
 وہ 'مخیر' حضرات جاچکے تھے ورنہ وہ یہ منظر بچشمِ خویش دیکھتے اور دُنیا کے مروجہ اصولوں
 کے برعکس ایک دوسرے اصول کا تجربہ بھی کر لیتے۔

دلِ بے نیازے کہ در سینہ دارم

گدرا دِھد شیوہ بادشاہے

چو پروین فرو ناید اندیشہ من

بدیوزہ پر تو مہر و ماہے

اگر آفتابے سوئے من خرامد

بشوخی بگردانم اور رازرا ہے

راجہ غضنفر علی خان کی ملاقات بھی مجھے یاد ہے۔ یہ بعد از نماز مغرب شیش محل میں ہوئی۔ والد محترم گلی والی باری کے ساتھ گاؤں تکیہ لگاٹے تشریف فرما تھے۔ راجہ صاحب مع اپنی جماعت کے جب صدر دروازہ سے داخل ہوئے تو بکمال احتیاط سگریٹ گل کی۔ برآمدہ سے گزر کر جب شیش محل میں داخل ہوئے تو اچانک گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلنا شروع کر دیا اور والد محترم کی نشست تک اسی طرح ایک شیرخوار بچے کی طرح چلتے گئے۔

مسلم لیگ کے انتخابات کے ضمن میں ”سدھن“ پیر ایک جلسہ عام بھی منعقد ہوا۔ میں بھی تماشائی تھا۔ راجہ غضنفر علی کے اس جلسہ کی صدارت کھارہ کے ایک سفید ریش پیر صاحب نے کی۔ میں ان کی صورت سے اس لئے متاثر ہوا کہ کھارہ کے پیروں کا متشرع ہونا بلندیوں سے اپنی رفعتوں سے دور بات تھی۔ یہ بزرگ پیر امیر شاہ صاحب مغفور تھے۔ اسی جلسہ میں راجہ صاحب مرحوم کے گزشتہ انتخابات کے مبنی برد و سخا و عدو پر مخالف جماعتوں، بالخصوص مجلس احرار کی طرف سے بڑی باغیانہ لے دے ہوئی تھی۔

اسی رونق میلہ کے دوران پیر صاحب سیال شریف کی آمد سنی۔ پیر صاحب مسلم لیگ کے حق میں تبلیغ، کے ضمن ہی میں آرہے تھے۔ صوفی علی محمد کفیش دوزان کا مرید خاص تھا وہ بڑی محنت سے سوہل کا مغرب کنارہ کشتی سے موٹر کے لئے ہموار کرتا رہا۔ شام کے قریب معلوم ہوا کہ پیر صاحب کہیں اور تشریف لے گئے ہیں۔

عین اسی رات کو مسجد خاتقاہ شریف کے شمالی حجروں میں آگ بھڑک اٹھی۔ رات کافی جا چکی تھی میں ایک بے سنگم سی افراتفری پر جا کا تو باہر رڑی، پرہ پرہائیوں کے ڈھول کی خوفناک تھاپ کسی ناگہانی مصیبت پر فوری اور ہنگامی امداد کے لئے فریاد کر رہی تھی۔ ماحول سخت پراسرار تھا۔ معلوم ہوا کہ باہر مسجد کے حجروں میں آگ آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ چونکہ یہ کمرے درویشوں کی رہائش گاہ بھی تھے۔ میں دم بخود ہو کر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں خیریت و عافیت کی دعائیں مانگنے لگا۔ افسوس کہ علی الصبح جب میں جائے حادثہ پر پہنچا تو۔

آگ کچھ ایسی لگی گھر میں کہ جو تھا جل گیا

والا معاملہ تھا۔ سامان، کپڑے، بستر، چارپائیاں سب کچھ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایک نابینا طالب علم جو ہمارا ہم جلس تھا۔ بڑا ہنس مکھ شریف اور معصوم زندہ نہ بچ سکا۔ مغربی حجرے کی شمال مغربی باری کے ساتھ اس کے وجود کے کچھ باقیات اتار پڑے تھے۔ یہ منظر آنا دہرا نگیز اور اذیت ناک تھا کہ دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بعد از نماز عصر مسجد کے صحن میں چارپائی کا سہارا لے کر والد محترم حادثہ کی تفصیلات سن رہے تھے۔ میں پاس کھڑا تھا۔ آگ بھڑکنے کی ابتدا سے لے کر حجروں سے طالب علموں کے انخلاء کے مراحل تک تمام جزئیات وہ نہایت خاموشی سے سنتے رہے۔ ان کے چہرے پر غیر معمولی کرب کے آثار بڑے نمایاں تھے۔ راوی جب حافظ نابینا کی بے چارگی کے قطعہ پر پہنچا تو ان کی آنکھیں اچانک چم چم برس پڑیں۔ انہوں نے ہاتھ پیشانی پر رکھ کر اس سیلاب کو روکنا چاہا لیکن ایسا نہ کر کے فرمایا کرتے کہ اسی سال سرہند شریف عرس مبارک پر جاہری

کے لئے تمام تیاریوں کے باوجود روانگی نہ ہو سکنے کی اصل وجہ یہی تھی۔

بہر حال بات تھی آٹھویں جماعت اور اس کے ماحول کی چونکہ سکول میں

گویا "ایم۔ اے" کی کلاس تھی چنانچہ قدرتی طور پر سب کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔

ہمارے خصوصی آلیق مولوی محمد امین صاحب مغفور جب غصہ میں یہ فرماتے کہ میں

نے ایسی نالائق جماعت زندگی میں نہیں دیکھی تھی، تو ہماری گردنیں ندامت سے

جھک جاتیں۔ بعد میں البتہ ہمیں پتہ چل گیا کہ یہ فقرہ وہ معمولاً دہراتے تھے۔ ملک عمریات

نوحہ، ملک محمد ریاض عرف پیر صاحب، ڈاکٹر حافظ محمد شریف (امریکہ) عمر اچہ صہ

سری رام، جلال الدین محمد اکبر اور محمد ایوب ولد صوبیدار لال خان صاحب مرحوم اس

جماعت کے چند سرکردہ طلباء میں سے تھے۔ جب موسم سرما نے رنگ جمانا شروع

کیا تو مولوی صاحب اور زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ رات کو بھی کلاس لینا شروع

کر دی۔ محمد ایوب صاحب مذکور اور میں شام کو اکٹھے سکول جاتے۔ یہی وہ دن تھے

جب پہلی مرتبہ میں نے ان کی زبان سے سنا

پس کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے

تیرھنم کدوں کے بت ہو گئے پڑانے

وہ شام کو بڑے ہلکے پھلکے موڑ میں ہوتے اور آنے والے امتحان کی تلخی کو ترنم

کی حلاوت میں تحلیل کرنے کی کوشش کرتے۔ نئے نئے فلمی گانوں سے بھی وہ اچھی طرح

متعارف تھے جنہیں وہ بڑے ذوق سے گنگتاتے

ساون کے بادلو! ان سے یہ جا کہو

تقدیر میں یہی تھا سا جن میرے نر و

آندھیاں غم کی یوں چلیں باغِ اجڑے کے رہ گیا
 سمجھے تھے آسرا جسے وہ بھی بچھڑ کے رہ گیا
 زندگی کا سا ز بھی کیا سا نہ ہے
 سچ رہا ہے اور بے آواز ہے
 جب تم ہی چلے پردیس لگا کر ٹھیس اور تم پیارا
 دُنیا میں کون ہمارا

ترجم کی خوبی ایک طرف لیکن میں یہ خیال کرتا کہ فلمی ماحول خاصا مادرِ پدہ آزلو
 ہوگا جسے میرے نزدیک 'لوفرانہ' قرار دینے میں کوئی حرج کی بات نہ تھی۔ اب اسے
 انحطاطِ زمانہ کا 'اعجاز' سمجھنے یا کچھ اور بہر حال اب یہ گیت "صوفیانہ" معلوم ہوتے
 ہیں بلکہ "صوفیوں" کے ایک خاص طبقہ 'خیال' کی مجالس میں 'وجداً فرنی' کا کام بھی ان
 سے آسانی لیا جاسکتا ہے۔

ورنیکولر فائیل کا امتحان

حاصل کلام یہ کہ فائیل امتحان کی تیاری کے یہ دن بڑے یادگار تھے۔ کیونکہ اس سے آگے پھر جماعت کے ایک خاندان، ہونے کا تصور باقی نہ رہ سکا۔ ہم طالب علم آپس میں کھل مل گئے تھے اور ہر لڑکا اپنی اور دیگر ہم جماعتوں کی کامیابی کے لئے دست بدعا رہتا۔ درحقیقت یہ جناب مولوی محمد امین صاحب مغفور کی ذاتی سرپرستی اور ان کی بے پایاں شفقت کا ثمر تھا کہ ”تاریخی طور پر نالائق ترین“ جماعت کا نتیجہ مثالی رہا اور دو ایک کے سوا سب کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

۴ فروری ۱۹۴۷ء کی سہ پہر بڑی میلی اور اُداس تھی۔ فائیل امتحان کا سنٹر پنڈدادنخان گورنمنٹ ہائی سکول وہ مقام تھا جسے میں وظیفہ کے امتحان کے ضمن میں ۱۹۴۳ء میں بھی دیکھ چکا تھا میں گھر سے جناب صوفی احمد خان صاحب مدظلہ العالی اور جناب مولانا غلام دستگیر صاحب میروئی (حال چہلم) کے ہمراہ پنڈدادنخان کے لئے روانہ ہوا۔ یہ وہ دن تھا جس دن منشی عین دین صاحب انتقال کر گئے۔ منشی جی اس زمانے میں معزز ترین انسان تصور ہوتے۔ وہ بڑے دراز قامت اور ہر نماز مسجد خالقہ شریف میں ادا کرنے کے عادی تھے۔ ”علم پٹوار“ کے ماہر۔ نماز ظہر کے بعد وہ اکثر میرے پاس بیٹھ جاتے اور اپنی پیرائے سالی کے باوجود بڑی دلچسپ باتیں سناتے۔ صوفی صاحب ان

سے احتراماً کوئی تعریف نہ کرتے۔ ”زینحاً“ کے اسباق میں تو وہ باقاعدہ شریک رہتے اور مولانا جامی کے انداز بیان کا صوفی صاحب کی تشریح و توضیح کے توسل سے اندازہ کر کے محفوظ ہوتے۔ بہر حال ایک بزرگ ہم سبق، کا ایسے وقت آخری سفر پر روانہ ہونا میرے لئے ذہنی اور قلبی دباؤ کا باعث ہوا تھا اس طور پر اس لئے کہ میں ان کے اس خاموش سفر آخرت میں ایک جوئیٹر پارٹنر کی حیثیت سے شریک ہونے سے بھی قاصر تھا۔

پنڈ دادنخان میں ہم جناب میاں سیف الدین صاحب خلیفہ مجاز حضرت صاحب ڈھڈی شریف قدس سرہ العزیز کے ہمان تھے۔ مسجد سے ملحق جنوبی کمرہ میں سامان رکھ کر مسجد میں داخل ہوئے تو فضا فیضانِ خاص سے معمور پائی۔ یہاں جناب میاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پینسٹھ، ستر برس کے بزرگ سادہ و پُر سوز لال سُرخ دارھی چہرے پر روشنی کی شعاعیں چھوڑ رہی تھی۔ انہی بے اعتنائی سے ملے کہ میں پریشان ہو گیا۔ تقریباً نصف مصافحہ پر اکتفا اور وہ بھی یوں کہ چہرہ اپنائیت کے تاثرات سے یکسر مبرا۔

”نہ طریقِ اِشْتِنَائِی نہ رسومِ جام و بادۃ“۔ خیریت تک نہ پوچھی۔ زبردست سادگی کے باوصف لوگ ان کی موجودگی میں موڈ ب اور خاموش تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنی رہائش گاہ پر گئے تو ایک بزرگ ہمارا کھانا اٹھائے کمرہ میں داخل ہوئے۔ میں مزید پریشان ہوا کہ یہ خود حضرت میاں صاحب تھے۔ اتنے خدام اور درویشوں کی موجودگی میں یہ کسرِ نفسی سبحان اللہ۔ جتنے روز وہاں قیام رہا اس معمول میں فرق نہ آیا۔ حتیٰ کہ صبح کی چائے بھی خود ہی لے کر آتے اور ہر دفعہ حلوس و مروت کا ایک نیا نقش چھوڑ جاتے۔ وہ پُرا نے نقشبندی بزرگوں کا نمونہ تھے۔ پاک اور لطیف

جذبوں کا اظہار ان کے نزدیک گناہ تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ تقریباً دو سال بعد جب وہ والدِ محترم کی تعزیت کے لئے تشریف لائے تو میں بھی اتفاق سے شیش محل میں موجود تھا۔ وہ نہایت خاموشی سے اندر داخل ہوئے اور چپ چاپ دوڑاؤ بیٹھ گئے۔ اسی مسلسل خاموشی کے عالم میں اچانک ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے قطرے اُبل پڑے مگر یہ سیلاب کمال ضبط کے ساتھ انہوں نے اپنی آنکھوں کے اندر ہی جذب کر لیا۔ حضرت علامہ نے فرمایا تھا ہے

سرمایہ درد تو غارت نتواں کر دن
اشکے کہ زردل خیز درد دیدہ شکست من

امتحان جناب صوفی صاحب کی سرپرستی میں بفضل اللہ تعالیٰ بخیر و خوبی سرانجام پایا۔ امتحان سے فراغت دراصل بوریات کے ایک طویل سلسلہ سے نجات کا دوسرا نام تھا۔ واپس پہنچا تو موسم کی گھٹن نصیب میں پکھری ہوئی خوشبو ڈول اور خوشنما پھولوں کی مسکراہٹوں میں تبدیل ہو چکی تھی اور نوازا زندہ شد در شاخساراں، کا سماں تھا۔ میرے لئے ایسی ہبہ گیر فراغت کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اگرچہ اس عرصہ میں ”زلیخا“ (مولینا جامی) اور ”سکندر نامہ“ (مولینا نظامی) کے اسباق جاری رہے۔ تاہم امتحان کی لٹکتی ہوئی تلوار سر سے ٹل گئی۔

جناب سالم صاحب سے گھر سواری کے جو دو چار طریقے سیکھے تھے اب ان سے دل بہلانے کے علاوہ کوئی دوسرا شغل نہ تھا۔ شکار، البتہ میری ایسی کمزوری تھی کہ کھیلنا تو درکنار محض اس کی تجویز یا لاکھ عمل پر غور کرنے ہی سے طبیعت کچھ سے کچھ ہو جاتی۔ چنانچہ اب پھلانا چھی سے شکاریات کی دلچسپ داستاںیں سننے اور

شکار کے پروگرام بنانے کے علاوہ کوئی صحیح دلچسپی نہ تھی۔

زمانہ ہوش کے ابتدائی ایام میں میں دیکھتا کہ کبھی کبھار والد محترم کافی دیر سے تشریف لاتے ایک مخصوص گروہ ان کے ساتھ پہنچتا اور شش محل میں ہرنوں، اڑیالوں اور بعض اوقات شکاری پرندوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ اس شام ان کی طبیعت بڑی خوشگوار ہوتی۔ ان کے ساتھی ان سے خاصی بے تکلف گفتگو کرتے۔ یہ شکاری جماعت فضل محمد عرف پھلو ماچھی، عظیم کنش دوز اور محمد بخش (ڈھڈھی شریف) اور شیر شدیال وغیرہ پر مشتمل ہوتی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی ذات میں اک انجمن تھا۔ بنشی محمد حسن صاحب بھی اگرچہ اسی جماعت کے ایک فرد تھے تاہم انہیں مکمل طور پر اس گروہ میں ضم کرنا غالباً درست نہ ہوگا۔ ویسے تو ان کے والد بزرگوار صوبیدار علی حیدر مرحوم بھی والد محترم کے شکاری رفیق رہے تھے لیکن بھجان کی پیرا نہ سالی کے علاوہ کچھ یاد نہیں۔ روایت ہے کہ آخری عمر میں نظر کی کمزوری کے باعث وہ بھال کے قابل نہ رہے تھے اور کسی دوسرے ہملی کے فائر سے بھٹ تیتروں کی ڈار جب اڑتی تو اندازے سے فائر کر دیتے اور کچھ گرا بھی لیتے۔

بہر حال ان سب پروگراموں کا میں بھد حسرت و یاس نظارہ کیا کرتا اور جب کبھی والد محترم میری موجودگی میں شکار کے ساز و سامان اور اپنے مخصوص گروہ کے ہمراہ رخصت ہوتے تو میرے دل میں حسرتوں کی ایک دنیا آباد کر جاتے۔ خلاف توقع ایک روز مجھے بھی ساتھ چلنے کی اجازت مل گئی۔ مختصر سا ایک آدھ گھنٹہ کا پروگرام تھا "سیلماں والی بہن" تک۔ یہاں بھٹ تیتروں میں وقت بسر

آتے اور پانی پی کر واپس چلے جاتے۔ میری موجودگی میں والد محترم نے فائبر کئے۔ وہ فائبر اس قدر تیزی سے کرتے تھے کہ خود ان کے شکاری معاہدہ انگشت بندوں رہ جاتے۔ ان کا نشانہ حیران کن حد تک درست تھا۔ یہاں تک کہ ان کے ہتھکڑوں میں کوئی بھی ان کا مد مقابل نہ تھا۔ ”سلیمان والی ٹوٹی“ پر اس روز شکار نہ ہو سکا۔ جو بھٹ تیراٹے وہ اتنے بلند پرواز تھے کہ بارہ بور کے پتے سے باہر ہی رہے اور فائبروں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

میری پھلتو سے ابھی تک صحیح شناسائی نہ تھی۔ البتہ اس کی مونچھوں سے نیچے ہونٹوں سے پھوٹی ہوئی مسکراہٹ میں بڑی اپنائیت تھی۔ یہ شخص چالیس کے پٹے میں تھا لیکن زمام اختیار دماغ نہیں دل کو تھما رکھی تھی۔ ”کھراڑی“ یعنی دامان کوہ سے لے کر بلند چوٹیوں اور دشوار گزار گھاٹیوں کے چپے چپے سے نہ صرف واقف بلکہ ان کے ساتھ وابستہ بڑی بڑی قیمتی داستاںیں جب وہ اپنے مخصوص لمبے میں سناٹا تو گزرے ہوئے زمانے کا حسن اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہونے لگتا۔ وہ اتنا پرمعلس انسان تھا کہ اس کے ہم عصر اس کے بغیر شکار کا نام لینا بھی گناہ سمجھتے شکار گاہ میں پہنچتے ہی وہ میر کارواں کے فرائض سنبھال لیتا اور پھر سبھی اسی کے تابع فرمان ہوجاتے۔ فتنی لحاظ سے معمولی سی چوک اس کا موڈ آف، کر دیتی اور پھر ساری جماعت بلا لحاظ حیثیت و منصب اس سے کئی کتر اتے خراب موڈ میں اس سے بات کرنے کا خطرہ مول لینا آسان بات نہ تھی۔

ایک مرتبہ ”ملاں والے ڈھیر“ سے براہِ عزیز محمد صیغۃ اللہ صاحب فائبر خوا کر کے واپس آ رہے تھے۔ نیچے پھلتو سخت غصہ میں محو انتظار صیغۃ اللہ صاحب نے اوپر

ہی سے اپنے دفاع میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ پھٹو نے وہیں کھڑے کھڑے زور سے کہا:

”تھلے اوناں تے میں تہنڈا ڈھڈھ چھنڈ پنڈاں“

یہ غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے کہ خاصی تعداد میں غیر تربیت یافتہ شکاریوں کی جماعت پیرکھارہ سے مغرب کی طرف ”پیٹرا“ اور ”پھٹواں“ کی طرف شکار کو نکلے صاحبزادہ عبدالرحمن صاحب و مسعود الرحمن صاحب از نورخانہ والا بھی اس میں شامل تھے۔ پھٹے نے بڑی دُور سے ہزار جتنوں کے ساتھ اڑیالوں کو ”اُولا“ اور کمال جہارت کے ساتھ مخمخش پیدل لڑا تھا کہ اڑیال غیر شکاری اراکین جماعت کی غیر سنجیدہ حرکات کی جھنک پا کر اصل راستہ سے ہٹ گئے اور کسی دوسری طرف بھاگ گئے۔ اس طرح ایک نہایت کامیاب اُولا، بالآخر پورے شکار کی ناکامی پر نتیجہ ہوا۔ پھٹو کو اس صورت حال کی پوری خبر تھی۔ جب وہ دونوں واپس آئے تو ہم پھٹو کی نگاہ سے چھپنے کی کوشش کرتے رہے۔ بہر حال اُس نے ہماری خوب خبر لی اور قسم اٹھائی کہ میں اُندہ ایسی غیر شکاری جماعت کے ساتھ کبھی شکار کے لئے نہیں اُڑوں گا۔ یہ دراصل اس کے (PRESSURE TACTICS) تھے ورنہ دوسری صبح کو وہ اتنا ہی ترقوازہ اور شکار کے پروگراموں کی جان ہوتا۔ بہر حال اس ناکام شکار سے دلہی پر سارے راستے وہ اپنے اصلی موڈ میں نہ آیا۔ ہم بھی محتاط رہے۔ جب یہ جماعت چچا جان کی حویلی کے قریب پہنچی تو شکاری دفاع کی گھنٹی گویا اب ختم ہو رہی تھی۔ مسعود الرحمن صاحب اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھٹو کے قریب ہو گئے اور بڑی رازداری سے پوچھا۔

”اُج تم ناراض کیوں ہو؟“

پھلو ایسے خداداد موقع کو ضائع کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ساری عجت

کو سنا کر بلند آواز سے کہا:

..... "میں وجہہ مارو ساڈوں"

سارے دن کی تھکاوٹ اور بوریات قہقہوں میں تحلیل ہو گئی۔

شکار میں نودار و حضرات اس کی جولانی طبع کا خاص طور پر نشا نہ بنتے چنانچہ حسین

موچی کو میر شکاری، کہتا۔ صوبیدار لال خان صاحب پر ایسی ایسی بر موقع بھتیاں کتا
کہ مجلس زعفران نارین جاتی۔

شکار کے میدان میں وہ والد محترم کے علاوہ محمد بخش ڈھڈھی شریف اور کسی

حد تک منشی محمد حسن صاحب کو شکاری تسلیم کرتا "سرواراد صہبہ" نامی ایک صاحب

البتہ پرانے زمانے میں گزرے۔ ان کا ذکر اصلی شکاریوں کے ضمن میں کرتا۔ عظیم صاحب

ڈھڈھی شریف کو مشکل برداشت کرتا۔ شکار گاہ کے اندر شکار کے آداب میں نے

اسی سے سیکھے اگرچہ پہلا فائر میں نے عظیم مذکور کی زیر ہدایت کیا جو لگ گیا۔ مجھے

یاد ہے کہ اُس روز مع بھائی صاحب قبلہ بھٹ تیترا اور گرین شکار کر کے بھڑاری

سے واپس آ رہے تھے۔ تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ شکار میں جناب بھائی

صاحب اور برادر عزیز صیغۃ اللہ کی مہارت مجھ سے بہتر تھی۔ ان دونوں کی تربیت

بھی پھلو نے ہی کی تھی درحقیقت وہ ہم سب بھائیوں سے بڑی شفقت سے

پیش آتا۔ والد محترم کی وفات کے بعد جب پہلی مرتبہ شکار کا پروگرام مرتب کرنے

بیٹھے تو آبدیدہ ہو کر اس نے اس شعر سے ملتے جلتے الفاظ ادا کئے

سر آمد روزگارِ آں، فقیرے

دگر دانائے راز آید کہ ناید

وہ مسلسل ۶۱۹۸۰ تک اپنی جسمانی کمزوری اور بھارت میں کمی کے باوجود
شکایات کے موضوع پر گفتگو اور پروگراموں کا مرکزی نقطہ تسلیم کیا جاتا رہا۔ وہ والدِ محترم
کا ہم عمر تھا۔

جون ۶۱۹۸۰ کی بات ہے میں وٹاڑی سے معراج شریف میں شمولیت کیلئے
گھر آیا تو مجھے یہ سن کر بہت پریشانی ہوئی کہ پھلُو بیمار ہے۔ میں شام کے دُھندلکے
میں برادریز نذیر محمد صیغتا اللہ صاحب کے ہمراہ اُس کے گھر پہنچا تو:

یکسر وہ اُستخوانِ نقابت سے چُود تھا

اُس نے اُٹھ کر ملنے کی ناکام کوشش بھی کی۔ زندگی جو رنگینیوں اور رعنائیوں
سے بھر پور تھی اپنے منطقی انجام کے قریب پہنچ کر ٹھہر سی گئی تھی۔ میں بظاہر تیرہ سالہ داری
میں مصروف، صاحبِ فراش کے ماضی کی انتہائی دلاؤ نیر فلم اپنے ذہن کے ویڈیو سسٹم
پر دیکھتا رہا اور جب اس منظر پر پہنچا ہے

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پر و جہاں

رقص میں لیلے رہی لیلے کے دیوانے رہے

توضیح میرے بس کی بات نہ رہی میں اپنے پرانے رفیقِ نخواستہ اور بزرگ سے زندگی کا
آخری مصافحہ کر کے بھاگ نکلا۔

گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب — سر دھی

غیر نصابی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں کہ ”فائل“ مہانتیہ آگیا۔ والد محترم کے سامنے ”ہائی کلاسز“ کے لئے دوہی ایسے ہائی سکول تھے جہاں مجھے وہ داخل کر سکتے تھے۔ گورنمنٹ ہائی سکول پنڈ دادنجان کی طرف ان کی طبیعت مائل نہ تھی۔ گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب میں البتہ اُس وقت جناب مولانا محمد معصوم صاحب مغفور عمری ٹیچر تھے اور والد محترم کے ساتھ ان کو بے حد عقیدت تھی۔ غالباً مولانا نے از خود یہ پیشکش کی تھی اور انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ میں البتہ خوشاب سے اس کی اجنبیت کی وجہ سے خائف تھا۔ بہر حال جب نویں جماعت میں داخلے کے لئے خوشاب پہنچا تو طبیعت اُداس تھی۔ مولانا خوشاب کے مغربی محلہ ”نیچاں والا“ میں حافظ ہدایت صاحب کی مسجد سے متصل ایک مکان میں رہائش پذیر تھے۔ مولانا کی کوئی اولاد نہ تھی لیکن دونوں میاں بیوی بڑے سکون اور اطمینان سے اپنی مدتِ حیات پوری کر رہے تھے۔ رسول بی صاحبہ جناب مولانا میاں احمد دین صاحب کھٹک کی بیٹی تھیں جو بڑے مُتقی اور پیر سرکار عالم دین تھے۔ ایک آدھ مرتبہ وہ میری موجودگی میں اپنی بیٹی کے پاس آئے۔ شریعت کے معاملہ میں اُن سے زیادہ بے لاگ آدمی کم دیکھنا نصیب ہوا۔ غالباً ثانی حضرت قدس سرہ العزیز سے بیعت تھی اور اتنے راسخ العقیدہ نقشبندی تھے کہ شیش محل میں حضرت قلندر (چاچڑ شریف) کی قوال

پر سب سے زیادہ جاندار احتجاج انہی کا تھا۔

اسکول میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد نصف سے زائد تھی۔ البتہ ان کی چال ڈھال سے اندازہ ہوتا کہ چل پڑنے کے دن آئے۔ ہندوستان ایک زبردست انقلاب کے دھانے پر کھڑا تھا اور تقسیم ملک کا مرحلہ لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہا تھا۔ بہر حال نویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے تعلیم کا آغاز ہو گیا۔

مولانا محمد معصوم عمری، جناب محمد منظور صاحب اُردو، جناب ملک نثار الدین صاحب انگریزی اور جناب عبدالسلام صاحب حساب کے اُستاد تھے۔ اسکول کی عمارت خاصی اچھی اور انگریزی حرفِ لاء کی طرز کی بنی ہوئی تھی۔ دونوں بازوؤں میں طویل گیلریاں تھیں۔ ہائی کلاسز کے طلباء مغربی بازو میں ہی بیٹھتے۔ صبح کی ”تعریف“ جناب حافظ عبدالرشید صاحب پڑھتے اور ایک سماں باندھ دیتے۔ مولانا مجھے نمازِ جمعہ کے لئے مسجدِ بادشاہان لے گئے جو خوشاب کے جنوب میں قدیم اور وسیع قبرستان کے ایک کنارے پر واقع ہے۔ بادشاہوں کے مزار پر جب حاضری دی تو اطمینان و سکون کی دولت سے مالا مال گھر پہنچا۔

گھر سے باہر رہنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ طبیعت بالکل ٹھنھی سی رہنے لگی اور کبھی کبھی تو یہ اندر کا غبار آنکھوں سے بھی چھلک پڑتا: ع
در سینہ نیا ساٹی از دیدہ بروں آئی

مجھے اپنے گاؤں کی گلیاں، وہاں کا ماحول، بچپن کے ساتھی اور گھر کی یاد اس قدر ستاتی کہ دل ڈوبنے لگا۔ میں اگرچہ زیادہ اچھا کھلاڑی نہ تھا تاہم اسکول کی فٹ بال ٹیم کا کپتان نامزد ہو گیا۔ ایک شام اسکول کے گراؤنڈ سے بدیر لوٹا۔ مسجد کے نمازی مغرب کی نماز ادا

کر کے گھروں کو جا چکے تھے۔ مولینا البتہ ابھی نوافل ادا کر رہے تھے کہ میں بھی پہنچ گیا۔ ہم اکٹھے مسجد سے باہر گئے مولینا نے ہدایت فرمائی کہ شام کو دیر سے لوٹنا ایک بُری عادت ہے۔ آئندہ ایسا نہ ہو، نیز فرمایا کہ نماز مغرب باجماعت ادا کی جانی چاہیے۔ عام نصاب کے ضمن میں یہ پہلی اور تقریباً آخری نصیحت تھی جس پر میں نے اپنے دو سالہ قیام کے دوران حتی الامکان عمل کیا۔

میں ہفتہ کی شام جب گھر آتا تو گھر والے میرے لئے سہرا پانتظار ہوتے اپنے ماحول میں لوٹ آنے اور والدہ ماجدہ کی زیارت نصیب ہونے سے طبعاً پر سکون ہو جاتی ہے

بے تکلف خندہ زن ہیں فکر سے آزاد ہیں

پھر اُسی کھوٹے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

قیام پاکستان کے بعد والدِ محترم نے ایک میٹری ریڈیو سیٹ خرید لیا جو کہ گاؤں میں پہلا ریڈیو تھا۔ وہ باقاعدگی سے خبریں سننے بلکہ مسجد کے نمازیوں کو بھی اس میں شامل کر لیتے۔ وہ تقسیم ملک کے نتیجہ میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات سے سخت مضطرب رہتے۔ اخبار کا انتظار ان کے لئے اعصاب شکن ہوتا۔ شکیل احمد جو اردو خبریں پڑھنے کا ایک خاص اسلوب رکھتے تھے، کالب و لہجہ بہت پسند فرماتے۔ ریڈیو کے بعد جب میں پہلی مرتبہ گھر آیا تو ریڈیو سننے کا شوق بے تاب کے ہوئے تھا۔ میں خبروں کے بعد گھر پہنچتا اور اب والدِ محترم سونے کے لئے باہر تشریف لے گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ اندر تشریف لائے۔ سب لوگ اس خلاف معمول آمد پر حیران رہ گئے۔ انہوں نے مجھے اشارہ سے بلایا اور شنگلہ کے اندر ریڈیو کے پاس لے گئے۔ ریڈیو شنگلہ میں جنوب مغربی

کونے میں ایک بڑے میز پر رکھا تھا۔ فرمایا یہ ریڈیو ہے تمہیں کیسا لگائیں تے اُس خوبصورت سیٹ کی بہت تعریف کی اور پھر ریڈیو قاہرہ سے آذان سنوائی تو عربی اور پنجابی لہجہ کے فرق کا پہلی دفعہ انکشاف ہوا۔

بہر حال پڑھائی جاری تھی کہ موسم گرما کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ یہ دو تین ماہ کا عرصہ قائدِ عظیم رحمۃ اللہ علیہ کی مومنانہ فراست اور عزم و استقلال کا صحیح امتحان تھا اور مسلمانانِ ہند کی قسمت کا فیصلہ بس اب ہوا ہی چاہتا تھا۔ دوسری طرف رمضان المبارک کی آمد آتی تھی اور والدِ محترم اس بار روزے بمقام سردھی رکھنے کے تمام انتظامات کر چکے تھے۔ سردھی گاؤں کے جنوب میں بلکہ فرلانگ دو فرلانگ ہٹ کر گالہ کے مقام پر مستری غلام رسول صاحب (سردھی) کی معرفت زمین کا کچھ ٹکڑا بوچھال خورد کے ایک شریف النفس زمیندار میاں وارث سے حاصل کر لیا گیا تھا۔ گالہ، کوہستان نمک کا وہ جنوبی کنارہ ہے جہاں سے تھل کا بھرپور نظارہ ممکن ہے۔ جنوب میں سرگودھا سے بھی آگے دکرانہ، پہاڑی کا منظر اور مشرق میں ملک وال کی روشنی صاف نظر آتی ہے۔ اس مقام پر بالخصوص خشک ہوا مسلسل چلتی رہتی ہے اور گرمیوں میں بھی یہاں سردیوں کی سی کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے۔

گزشتہ سال والدِ محترم رمضان المبارک کے جہتہ میں شملہ تشریف لے گئے تھے جہاں جناب بھائی صاحب نے مولینا محمد معصوم صاحب کی سماعت میں قرآن پاک سُنا یا تھا۔ تقسیم ملک کی آمد آمد کے پیش نظر اس دفعہ یہ سفر ممکن نہ تھا۔ سردھی میں دو مہرے تعمیر کئے گئے۔ صوفی صدرالدین کفیش دوز اس خدمت میں پیش پیش تھا۔ تقریباً ۱۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو رمضان المبارک کا یہ قافلہ بعد از نمازِ ظہر لڈ شریف سے چل پڑا۔ والدِ محترم کے ہمراہ صوفی صدرالدین صاحب مزدور تھے۔ حتیٰ کہ جب کھڑکی میں جھکڑ کا سامنا ہوا تو والدِ محترم نے

گھوڑا ایک جھاڑی نما درخت کی اوٹ میں کر لیا۔ بہر حال اس نئے مستقر پر سب سے اقل وُرد میرا اور صوفی امام الدین "جٹھل" کا ہوا۔ پہاڑوں میں گھرا ہوا یہ ویلانہ شام کے دُھندلکے میں بڑا خوفناک معلوم ہوا لیکن جب کارواں کے شرکاء اکر "گرتا" شروع ہوئے تو کچھ ہمت بندھ گئی اور میرا کارواں جب تشریف لائے تو یہ افسردہ خزاں گویا بہا میں تبدیل ہو گئی۔

یہاں اس جنگل کو آباد کرنا خاصا جان جو کھوں کا کام تھا۔ رہائش کے لئے صرف دو کمرے تھے شمالی کمرہ والدِ محترم کے لئے مخصوص تھا۔ انہوں نے کھوکھرا لاکے ایک جان نثار صوبیدار نور محمد المعروف "گھیلا" جن کا نومبر ۱۹۸۶ء میں بمقام بھکر انتقال ہوا، سے ایک رہائشی خیمہ مستعار لیا تاکہ کچھ سہولت پیدا ہو۔ شرکائے کارواں نے اس مبارک جہینہ کی ابتداء کلامِ الہی کی تلاوت سے اس انداز میں کی کہ پہاڑ کے پہاڑ گونج اُٹھے۔ علی الصبح جب والدِ محترم قحیل کا نظارہ کرتے تو وہاں کے حبس اور یہاں کی مسلسل لطیف اور خنک ہوا کا تقابل کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے فرماتے:

چپے اُتے و سداں کہی کشمیر بنائی ہوئی اُ

اگرچہ رمضان شریف کے معمولات بجائے خود ایک امتحان سے کم نہیں ہوتے تاہم سردھی میں انہوں نے بہت سائیکری کام اپنی موجودگی میں کر لیا۔ میاں محمد دین حجام مرحوم لاہور مستقلاً ان کی خدمت میں رہے۔ مولوی محمد جی صاحب معذور از دیوبند (راولپنڈی) میاں غلام جیلانی صاحب رتہ شریف رمضان المبارک میں ان سے ملنے آئے اور اس طرح اس قافلے کے شرکاء میں اپنا نام درج کرا گئے۔

میں اور برادرِ عزیز محمد صبغۃ اللہ صاحب شکار وغیرہ کے بہانے نیچے باغوں میں چلے جاتے اور خاصے دشوار پہاڑی سفر کے باوجود روزہ کا خاص احساس نہ ہوتا۔ اکثر مغربی

سمت والی پہاڑی پر پڑانے تعمیر شدہ سکول کے غیر آباد کمروں میں وقت گزارتے مستری
 غلام رسول صاحب کے گھر "واجہ" سُننے بھی چلے جاتے۔ پُلنے ریکارڈ تھے۔ ایک تو والی
 ہمیں بہت پسند تھی ہے

انکھ کھلتے ہی تصویر یار کارو پوش تھا

پھر وہی میں تھا وہی دریائے علم کا جوش تھا

ایک مرتبہ مستری صاحب والدِ محترم کی فرمائش پر واجہ گالہ پر بھی لے آئے۔

انہوں نے گانا "اک تیرا سہارا سنا" تو دیر تک عالمِ محویت میں گم گم بیٹھے رہے۔ انہوں

نے جنوبی طرف نسبتاً ایک نیچی سطح کی ڈھیری پر اپنے لئے ایک تھڑا سا بنوایا تھا۔ ایک بل

کھاتے ہوئے راستے سے علی الصبح اُپر جاتے اور وہاں کہسی پر بیٹھ کر اس بلندی سے گرد و نواح

کا نظارہ کرتے رہتے۔ اسی مقام پر ان کی ملاقات پیر صاحب کھارہ شاہ غلام صاحب سے

ہوئی تھی وہ غالباً میدان سے واپس جا رہے تھے کہ والدِ محترم کو تنہا دیکھ کر رُک گئے اور

اُپر ڈھیری پر جا کر اُن سے ملاقات کی۔

۱۹۴۸ء کی عید الفطر ان کی زندگی کی آخری عید تھی اُس روز علی الصبح وہ حسبِ معمول

اسی تھڑا پر بیٹھے تھے کہ مجھے اشارہ سے اُپر بلایا۔ میں وہاں جا کر نیچے بیٹھ گیا۔ پوچھا روزے

پورے رکھے ہیں۔ میں نے کہا پہلا روزہ مشکوک تھا رہ گیا ہے فرمایا ایسا نہیں ہونا

چاہیے تھا اب اسے قضا کر لینا۔

۱۹۴۷ء کے رمضان المبارک کی ستائیسویں رات ۱۳ اگست کو تھی۔ علی الصبح

جمعۃ الوداع تھا اور دنیا کے نقشہ پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی ایک

سلطنت معرضِ وجود میں آرہی تھی۔ اُس رات بہت ہی مسرور و مطمئن تھے۔ ختم قرآن پاک کے

بعد اسی جگہ بیٹھے رہے۔ حافظ محمد لطیف چکوڑہ کو غالباً اس کے والد کی خواہش پر داخل طریق

کیا۔ معاً بعد مجھے بلایا اور مجھے بیعت کے لئے فرمایا یہ حکم خلاف توقع بھی تھا اور خلاف معمول بھی میں نے خوشگوار حیرت کے دوران اپنے ہاتھ ان کے مبارک ہاتھوں میں دے دیئے۔ سب شرکائے مجلس ہم دونوں کی خوش بختی پر رشک کر رہے تھے۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور سٹائیسویں کی شب تھی۔ میں آج بھی اپنی اس خوش نصیبی پر تازاں و فرحاں اللہ جل شانہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں۔

غالباً یہی سبب ہے کہ سردھی سے ایک خاص قلبی اور روحانی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سال برس سال جانے کا معمول تو ختم ہو گیا لیکن وہ تعلق خاطر آج بھی بدستور قائم ہے چنانچہ ایک طویل مدت کے بعد ۱۹۸۶ء کے رمضان المبارک میں ڈاکٹر ریاض احمد صاحب رحمہ اللہ کے ہمراہ انک سے میں جب بھائی صاحب کو ملنے سردھی گیا تو وہاں جا کر طبیعت کو سنبھالنا خاصاً مشکل ثابت ہوا۔

ختم خواجگان سے فارغ ہو کر میں اپنے پرنے تاریخی اور متبرک مستقر کی طرف نکل گیا۔ کون تھا اس وقت جو میرے احساسات و تاثرات کا احاطہ کرتا۔ میں دم بخود رہ گیا۔ ان آثار کو دیکھتا رہا جن کے کنارے کبھی ایک پرنور کارواں نے ڈیرے ڈالے تھے۔ میں فروداً فروداً ان ”باقیات الصالحات“ کے پاس گیا اور عالم بے خودی میں ان سے بڑی بڑی راز کی باتیں کیں۔ بعض آثار تو مجھے دیکھتے ہی توجہ کناں ہو گئے۔ وہ اپنی اصلی حالت پر اسی طرح قائم تھے اور انہوں نے اسی حالت میں والد محترم کی زیارت کی تھی۔

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت

فروغِ زندگی تابِ شرر بود

ولیکن گز نہ رنجی با تو گویم

صنم از آدمی پائندہ تر بود

(قیامت برپا ہوئی تو ایک برہمن نے داؤدِ محشر کے حضور
گزارش کی کہ بنی نوع انسان بڑی ناپائیدار چیز تھی۔ اگر آپ
معاف فرمائیں تو میں عرض کر دوں کہ اس سے تو میرے بنائے
ہوئے بُت زیادہ پائیدار تھے)

میں ان کی ڈھیری والی نشست گاہ پر گیا۔ یہاں ہی انہوں نے مجھے زندگی کی آخری
نصیحت فرمائی تھی۔ ان کی نشست گاہ مردِ زمانہ کے باعث بالکل درہم برہم ہو چکی
تھی۔ یہ خوبصورت ہموار اور مہتاباثرہ آبِ بمشکل ایک نشان کی صورت میں باقی تھا۔ زمانہ
کی ناپائیداری اور زُودِ فراموشی سے میرا دم گھٹنے لگا۔ میرا جی چاہا کہ پودے زود سے
دھاڑیں مار مار کر شور مچاؤں مگر ایسا کرنے سکا۔ میں نے چاہا کہ اس متبرک یادگار کی کچھ
ٹوک پلک ہی منوار دوں۔ لیکن اسے پھیرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

سحرے گفت خاکستر صبارا

فسرد از بادِ این صحرا شرام

گذر نرنگ پریشا تم مگر داں

ز سوزِ کاروانے یادگارم

(ایک صبح خاکستر صبا سے مخاطب ہوئی کہ اس صحرا کی ہوا
ہی سے میری چنگاری بچھ گئی تھی۔ تم اپنی رفتار کو آہستہ رکھو
اور مجھے پریشان نہ کرو کیونکہ میں تو کسی زمانے میں یہاں
سے گزرنے والے کارواں کے الاؤ کی یادگار ہوں)

دو سال قبل تروالد محترم نے رمضان المبارک سردھی میں گزارا اور اس ویرانے
کو رشکِ بہاراں کرتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ کچھ روزہ کے لئے مزید ٹھہر گئے لیکن ہم
سب بھائی وطن آ گئے۔ انہی دنوں میں وہ تاریخی ماسلا دھار بارش برسی جس سے

بلکہ شریف کے اکثر مکان منہدم ہو گئے۔ پیر کھارہ گاؤں بارشہی نالہ سوہل، کی نظر ہو گیا
اولیٰ علی حضرت قدس سرہ العزیز کی مسجد کا مینار بھی ایک بڑی دیراڑ نمودار ہونے کے
باعث شہید کرنا پڑا۔

وہ بڑی ہی بھیانک رات تھی۔ جناب بھائی صاحب برادران عزیز رحمہ اللہ
صاحب اور محمد حجتہ اللہ صاحب، حافظ غلام مرتضیٰ از دیوی (ضلع راولپنڈی) اور میں مسجد
خاندانہ شریف میں نماز مغرب ادا کر کے بارشہی تھمنے کا انتظار کر رہے تھے کہ حاجی میاں
محمد مرزا صاحب درویش جو اس وقت تک صرف ”میاں مرجا“ تھے، نے خفگی سے
کہا کہ بارشہی کے آثار خیریت کا پتہ نہیں دے رہے۔ آپ لوگ گھر جائیں وہاں کوئی
معی نہیں۔ اس وقت عام گلیوں میں بھی پانی گھٹنوں کے قریب تک بہ رہا تھا۔ ہم
گھر پہنچے تو دادی جان اور ہمیشہ صاحبہ کی جان میں جان آئی۔ ہم اوپر بنگلہ میں بیٹھے
تھے رات آہستہ آہستہ بڑا سمر ہوتی جا رہی تھی بارشہی کی کمی کے دور دور تک کوئی
آثار نہ تھے۔ پہلے پہل تو خوش گپیوں سے گزارا ہوتا رہا لیکن گروہ نواح کے مکان جب
گہنا شروع ہوئے اور ان کے مکینوں نے آسمان سرسراٹھایا تو ہمیں حالات کی
سنگینی کا صحیح احساس ہوا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دادی جان حضرت حاجی ٹھٹھے والے
مسل دھکیاں دے رہے تھے کہ ہم باہر آ رہے ہیں۔ ہمارے سمجھانے بچانے اور
منت سماجت سے وہ کچھ رُک جاتے۔

بے چارگاہ اور بے بسی کا احساس لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا کہ ہمارے ہمسایوں یعنی
پھپھروں کا ایک کوٹھان زبردست دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ اب تو حاجی کو
روکنا ہمارے بس کی بات نہ رہی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ صاحبہ کو پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے
ہوئے اس اعلان کے تکرار کے ساتھ باہر آ گئے کہ ”ہم بھی آ رہے ہیں۔ ہم بھی آ رہے ہیں“
غلام مرتضیٰ فوراً دوسری طرف ہو گیا اور وہ برآمدہ میں آکر بیٹھ گئے۔ مکانات کا انہدام

جاری رہا۔ سحر کے وقت نالہ سوہل، کی طرف سے ایسا شور سنائی دیا کہ پھر سننے میں نہیں آیا۔ ایسا پتہ چلتا کہ پورے گاؤں کو بہا کسے جانے لگا۔ بارہ چودہ گھنٹے ایک ہی رفتار سے برسنے والی یہ بارش بفضل اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ تھمنے لگی جو تقریباً صبح نو دس بجے تک بوند باندی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ آہ و فغاں کی چار سو کوئی کمی نہ تھی ماں جی کی دعاؤں کا اتنا اثر ہوا کہ ان بے شمار حادثات میں کوئی بھی جانی نقصان نہ ہوا تھا۔

دوپہر کے قریب جب گرد و پیش کا جائزہ لینے نکلے تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر فرد کچھ نہ کچھ اس طوفان کی نذر کر چکا تھا۔ سوہل، کی طوفانی لہریں بدستور کسی ڈرامہ کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ صبح بھی بڑی افسردہ اور سوگوار تھی۔ جنگل سے متصل گلی پر بنایا ہوا غسل خانہ گر گیا تھا جس سے گلی کا پانی رگڑ کا اور مسجد کی جنوبی اور شیش محل کی شمالی دیواروں میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئیں۔ یہ گویا اس کیفیات سے بھر پور تجلیات کی مخزن اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کی اس یکتائے روزگار پختہ مسجد، کو گرا کر نئی مسجد تعمیر کرنے کا نقطہ آغاز تھا۔ اگر یہ دراڑ، نمودار نہ ہوتی تو شاید علم محترم اس مسجد کو شہید کر کے نئی مسجد تعمیر کرنے کا پروگرام ہی مرتب نہ کرتے۔

اس مسجد میں نے صوفی بزرگوں کو طویل مراقبے کرتے دیکھا۔ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ (نانا جان) فرماتے کہ اعلیٰ حضرت کی اس مسجد میں جو کیفیات اور فیضان تھا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہ آیا۔ مجلس احرار اسلام کے ایک سرکردہ رہنما مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی جب اللہ شریف آئے تو چچا جان کے ہاں مہمان ٹھہرے۔ وہ بقول علم محترم اس مسجد میں نماز پڑھ کر پڑے متاثر ہوئے اور بقول شخصے ”وہابی“ ہونے کے باوجود وجدان اور فیضان کی کیفیات کا پڑے ہی ٹوٹا انداز میں بار بار تذکرہ کرتے رہے۔

اعلیٰ حضرت للہی قدس سرۃ العزیز

ہمارے مورثِ اعلیٰ حضرت نوابہ علامہ نبی رحمۃ اللہ علیہ ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت جمرات کی شب ۱۲۳۲ ہجری (بعض روایات میں ۱۲۳۳ ہجری) بمقامِ بلدہ شریف ہوئی۔ سن عیسوی اگر شمار کیا جائے تو یہ ۱۸۱۸ تھا۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا مخدوم محمد حسن دین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بلدہ بھروانہ میں رہتے تھے۔ عالم دین اور متقی بزرگ تھے۔

اعلیٰ حضرت قدس سرۃ العزیز نے فارسی اور درسی نظامی کے عربی حصہ کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں اور شرح ملا جو کہ علم نحو کی آخری کتابوں میں شمار کی جاتی ہے تک علم کی تکمیل بلدہ شریف ہی میں کی۔ حصول علم کے لئے آپ شہر حکیوال سے متصل گاؤں اوڈھروال کے ایک جید عالم دین حافظ محمد سرور صاحب کے پاس تشریف لے گئے اور معقولات جو کہ فن منطق ہی کی انتہائی شکل ہے کی تکمیل کی۔ اس کے بعد پشاور میں حضرت مفتی محمد احسن صاحب، حافظ دراز صاحب اور بعض روایات کے مطابق حافظ محمد عظیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں باقی ماندہ نصابی کتب کی تکمیل فرمائی۔ پشاور کے جید علمائے دین کے ہاں آپ نے خاص طور پر نصاب نظامی کی وہ انتہائی کتابیں پڑھیں جن کے نام تک آج کل کے اکثر علماء کو معلوم نہیں۔ مثلاً ”زوائد ثلاثہ“

جو علم "معقول" کی آخری کتاب ہے۔ شرح حنفینی (علم فلسفہ) انھوں نے یوسف رتاریخ و میرت (وہدایت الحکمتہ اور الحکمتہ الکبریٰ) (علم فلسفہ)۔ نہاب نظامی کی تکمیل کے بعد آپ روایت کے مطابق اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں گھر تشریف لائے اور انہی کے زیر سایہ ۱۸۴۵ء میں ۲۸ سال کی عمر میں درس و تدریس کا آغاز فرمایا۔

ظاہری علوم کے حصول میں آپ نے جس غیر معمولی ذہانت و فطانت کا ثبوت دیا تھا اُس سے بھی کئی گنا استعداد و صلاحیت حصول علم باطن کے لئے قدرت نے آپ کو ودیعت فرمائی تھی۔ چنانچہ جب آپ اس طرف راغب ہوئے تو اپنے پیش روؤں کے لئے بھی ایک مثال بن گئے۔ اُس وقت پنجاب کے اندر چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے پیر کامل حضرت خواجہ تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کا عام شہرہ تھا۔ آپ انہی سے بیعت کا ارادہ کر کے گھر سے روانہ ہوئے۔ بمقام شاہ پور (ضلع سرگودھا) پہنچے تو اتفاقاً حضرت مولانا خواجہ غلام محمد الدین قصوری دایم والمقصوری قادری، نقشبندی مجددی سے ملاقات ہوئی۔ حضرت پیر قصوریؒ اُس زمانہ میں نسبت مجددی کے تاجدارِ عظیم جناب حضرت شاہ غلام علی شاہ صاحب دہلوی قدس سرہ العزیز کی ساری عمر کی کماٹی کا حصول الحصول تھے۔ سبحان اللہ! ظ

دولتے ہست کہ یا بی سر را ہے گا ہے

استخارہ ہمسنونہ کے بعد پورے اطمینان قلب سے آپ نے ۱۴ ربیع الاول ۱۲۶۲ ہجری (۱۱ اپریل ۱۸۴۶ء) کو آپ سے بیعت کر لی۔ حضرت اپنے بیاض میں اس طرح رقمطراز ہیں:

”مجھ فقیر غلام نبی کی ولادت شب پنج شنبہ کو ہوئی۔ نکاح بھی

شب پنج شنبہ (جمعرات) ہی کو ہوا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی

نشب کو حضرت پیر دستگیر علیہ القادر حیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی
وفات ہوئی۔ ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۶۲ ہجری میں حضرت
قصوری شیخ غلام محی الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت
کی۔ اپنے پیر دستگیر کی صحبت کی تفصیل یوں ہے۔

پہلی بار..... چار روز
دوسری بار..... ایک ماہ
تیسری بار..... ڈیڑھ ماہ
چوتھی بار..... بیس دن
پانچویں بار..... تین روز
چھٹی بار..... چھ ماہ آٹھ روز
ساتویں بار..... دس روز
آٹھویں بار..... تیس روز (۲۳ دن)
نویں بار..... آٹھ روز

کے کل مدت قیام گیارہ ماہ ایک دن

حضرت پیر قصوری دائم الحضور رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۲۱ ذی القعدہ ۱۲۷۰ھ
(۱۵ اگست ۱۸۵۴ء) کو ہوئی۔ گویا بیعت کے بعد آپ کو صرف تقریباً آٹھ سال تک
اپنے مرشد کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ اس قلیل عرصہ میں آپ نے اپنے
رہبرِ کامل سے کیا حاصل کیا۔ اس کے بارے میں حضرت پیر قصوری نے اپنے مکتوبات
میں ارشاد فرماتے ہیں:

”حضرت مولوی غلام نبی جو ایک کامل الاستعداد مرد تھے، موضع بلد سے

جو بھیرہ کے قریب ہے۔ پچھلے ماہ کا تک میں نسبت احمدیہ مجددیہ کے اکتساب کے لئے فقیر کے پاس آئے۔ چھ ماہ تک اس میں مشغول رہے اور سلوک کو حقیقت الحقائق تک پہنچا کر رخصت ہوئے۔ ان کی استعداد کے بارے میں کیا لکھا جائے کہ اس میں بے نظیر تھے۔ بارک اللہ فیما اعطا۔

سبحان اللہ! جس مردِ با صفا کے بارے میں اس کے مرشدِ بانہدا کے تاثرات ابتداء ہی میں ایسے ہوں۔ اس کی باطنی استعداد اور روحانی صلاحیت کے بارے میں مزید کوئی تبصرہ اس کے مرشدِ اکمل کے مقابلہ میں گستاخی کے مترادف ہو گا۔

وادیِ عشق سے دُور دراز است ولے

طے شود جادہٴ وحد سالہ بر آبے گا ہے

(محبت کی وادی بڑی طویل مسافت پر واقع ہے لیکن

یہ دُور دراز کا سفر بعض اوقات ایک آہِ سر سے بھی

طے کر لیا جاتا ہے۔)

حضرت قدس سرہ العزیز نے جب اپنے پیروستگیر رحمتہ اللہ علیہ سے مراقبہ کلماتِ نبوت کی اجازت پائی تو حفظِ قرآنِ حکیم کی طرف یوں ہمہ تن و ہمہ وقت متوجہ ہوئے کہ صرف چھ ماہ میں قرآنِ پاک حفظ کر کے رمضان المبارک میں سنا بھی دیا۔ مولانا امام دین کھڑکوی مؤلف ”مقاماتِ طیبین“ جس میں انہوں نے اپنے مرشد کے حالات و کوائف بزبانِ فارسی قلمبند کئے تھے اور جس کا ترجمہ سید احمد سعید بھدانی نے جو اسی گاؤں کے ایک فاضل بزرگ ہیں نے تقریباً ایک سو

سال بعد کیا تحریر فرماتے ہیں:

”جب آپ کے مرشد حضرت قصوریؒ کو آپ کے قرآنِ کریم

حفظ کرنے کی اطلاع ہوئی تو..... اس سے انہیں استقدر

مسترت ہوئی کہ حیثیتِ تحریر سے باہر ہے“

حضرت دائم الحضورِ قدس سرہ العزیز نے اپنے ایک مکتوب شریف میں

تحریر فرمایا:

”فَحَمْدُ اللَّهِ ثُمَّ حَمْدُ اللَّهِ حِفْظُ كَلَامِ اللَّهِ تَخْصِيصًا لِأَهْلِ الْإِسْلَامِ

کے لئے نعمت ہے کہ اس کے برابر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی“

اعلیٰ حضرت کے معاصرین اس بارے میں متفق ہیں کہ آپ جلال و جمال کا ایک

حسین امتزاج تھے۔ آپ نے اس ”وادیٰ غیر ذی زرع“ کی کایا پلٹ کے رکھ دی۔

کبھی خود لہ کاؤس کے اجڈپن کا یہ عالم تھا کہ پورے گاؤں میں حفظِ قرآن مجید باید و شاید

پھر کبھی وہ زمانہ بھی آیا کہ آپ کی مسالی سے بلا مبالغہ ہزاروں حفاظ پیدا ہوئے

اور یہ سلسلہ بفضلِ اللہ تعالیٰ جاری و ساری ہے۔ بے شمار مسلمانوں کو اللہ کے دین

اور سنتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ صرف راغب کیا بلکہ ان کے

قلوب میں فہم دین اور اتباعِ سنت کا ایسا ذوق پیدا کر دیا کہ ان کے دل اس نور

سے منور ہو گئے۔ دورِ دور تک کے علاقوں سے طالبانِ حق آپ کے چشمہ فیض

سے حسب استطاعت اپنی پیاس بجھاتے ”کریم“ شیخِ سعودیؒ سے لیکر منطق و

معقول فلسفہ و حکمت بشمول حدیث شریف و تفسیر تک تمام اسباقِ بنفسِ نفیس

پڑھاتے۔

جناب مولانا امام دین صاحب لکھتے ہیں کہ آپ کے درس میں ستر، اسی طلباء ہمیشہ

زیر تعلیم و تربیت رہتے۔ بقول مولانا:

”ہر طالب علم کے لئے ظاہری و باطنی دلداری علیحدہ علیحدہ ہوتی

..... بچاس سے زائد طلباء و وظیفہ حضرت سے لیتے تھے

اور ان میں سے بعض تو اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے

مثلاً حضرت مولوی بزرگ اللہ جو ایسا صاحب مصنف ”رسالہ

نوری“ حافظ رکن الدین چکوڑہ (چکوال) مولوی اللہ دین صاحب

نیکی والا اور مولوی محمد ابراہیم صاحب شہیداں والی (گجرات)

وغیر ہم“

مستقل مزاج ایسے کہ نماز تہجد سے قبل غسل کرنے کا عمل یوم وفات کو بھی قضا نہ

ہوا۔ غرض کہ ان کی جلائی ہوئی شمع کی لواتنی پُر نور اور روشن تھی کہ ایک جہاں اس کی شعاعوں

سے مستنیر ہو گیا۔ یہاں تک کہ آج اس گئے گزرے دور میں بھی اس فیضان کے گہرے

نقوش حاضر و موجود ہیں۔

چنانچہ جون ۱۹۷۲ء میں میں کسی کام کے سلسلہ میں لاہور گیا۔ الحاج حافظ محمد اشرف

صاحب کلیار (سرگودھا) سے ملا تو معلوم ہوا کہ مولانا درخواستی ان کے ہاں تشریف فرما

ہیں۔ مولانا نے بعد از نماز ظہر ایک مختصر سی مسجد میں حاضرین سے بڑا دلنشین خطاب

فرمایا، سادہ و پُر سوز۔ یہاں سے اٹھے تو کسی عقیدتمند کے ہاں جانے کا پروگرام تھا۔

کلیار صاحب کی موٹر میں اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ مجھے بھی اسی میں سوار ہو کر گجرات کے لئے

بس پکڑنا تھی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ راستہ میں مولانا نے کلیار صاحب سے دریافت فرمایا کہ یہ اجنبی

کون ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرا دوست ہے نام بہت پستد فرمایا۔ پھر پوچھا کہاں کا رہنے والا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ضلع جہلم میں ایک گاؤں ہے، اللہ، میں وہاں کا رہنے والا ہوں۔ مولینا نے اچانک مڑ کر مجھے بغور دیکھا اور فرمایا 'اللہ، مت کہو، اللہ شریف، کہو میں خاموش ہو گیا۔ پھر فرمایا کہ اس گاؤں میں ایک بزرگ گزرے ہیں جن کی مساعی سے بے شمار خلقت نے راہ ہدایت پائی۔ آپ ان سے متعارف ہیں۔ میں جو اب کچھ عرض کر کے مولینا کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میرے دوست نے فوراً کہہ دیا کہ یہ اسی خاندان کا ایک فرد ہے۔ اس پر حضرت نے فوراً گاڑی رکوائی اور خود گاڑی سے باہر تشریف لائے۔ میں عرق انفعال میں غرق باہر نکلا تو انہوں نے مجھے گلے لگالیا اور اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر بٹھایا۔ بے پایاں شفقت فرمائی اور پرتائیر دعاؤں کے ساتھ رخصت فرمایا۔ سبحان اللہ۔

اَل فِقْر كِه بے تیغے صد کشورِ دل گیرد

از شوکتِ دارا پہ از فرّ فریدوں بہ

آپ کی وفات سے چند روز قبل یعنی ذی الحج الاول ۱۳۰۶ ہجری (نومبر ۱۸۸۸ء) ایک طالب علم نے آکر اسباق شروع کرنے کی درخواست کی۔ فرمایا ایک سفر و پیش ہے اگر نہ گیا تو سبق شروع کرادونگا۔ تم فلاں تاریخ کو آجانا۔ طالب علم مقررہ تاریخ ۲۴ نومبر ۱۸۸۸ء کو پہنچا تو آپ کی تجہیز و تکفین ہو رہی تھی۔ آپ نے اپنی مسجد میں قبل از نماز ظہر مسواک طلب فرمایا اور مؤذن کو اذان کے لئے کہا۔ مؤذن جب کلمہ اشہد ان لا الہ الا اللہ اور بعض روایات کے مطابق اشہد ان لا الہ الا اللہ پر پہنچا تو آپ یہی کلمہ دہراتے ہوئے پیچھے جھکتے گئے اور فرش مسجد پر دراز ہو گئے۔

آپ کی مفصل سوانح عمری تو انیسویں کہیں بھی دستیاب نہیں البتہ بعض خلفاء

نے آپ کے مختصر حالات قلمبند کئے۔ ان تصنیفات میں سب سے زیادہ شہرت
 ”حالات مشائخ نقشبندیہ“ کو حاصل ہوئی جسے آپ کے خلیفہ اجل حضرت مولانا
 محمد حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن کوٹلہ ضلع بجنور (لوہ پی) بھارت نے
 تقریباً ۱۹۱۳ء میں مکمل کیا تھا۔ یہ تصنیف اپنے موضوع اور افادیت کے اعتبار سے
 منفرد تھی جس کی وجہ سے اسے قبول عام حاصل ہوا۔

”مقاماتِ طیبین“ مولانا امام دین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو آپ کے
 خلفاء میں سے تھے، فارسی میں تصنیف کی۔ جس کا اردو ترجمہ ”تذکرہ اعلیٰ حضرت
 للہی“ کے نام سے جناب سید سعید احمد مدانی نے شائع کرایا۔

ملفوظات اعلیٰ حضرت للہی مرتبہ مصنف ”حالات مشائخ نقشبندیہ“ اور
 مکتوبات اعلیٰ حضرت للہی بھی مرتب کئے گئے۔ اس کے علاوہ حضرت پیر قصوری
 دائم الحضور قدس سرہ العزیز کے خلیفہ حضرت مولانا صالح محمد کنجاہی (گجرات) نے
 اپنی تالیف ”سلسلۃ الاولیاء“ میں حضرت للہی کا نہایت دلنشین اور عقیدت سے
 بھرپور ذکر کیا۔ حضرت مولانا غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ بیرویل شریف (سرگودھا)
 نے بھی اپنے رسالہ میں آپ کے حالات زندگی قلمبند کئے۔ افسوس کہ مؤخر الذکر دونوں
 کتابیں اس وقت دستیاب نہیں۔ آپ کے حالات زندگی اور ملفوظات پر مبنی
 تازہ ترین تالیف ”انوار حضرت للہی“ جناب صاحبزادہ محمد مطلوب الرسول صاحب
 کی مرتب کردہ ہے۔

اور آزادی میں بجز بیکراں ہے زندگی

میں نے اپنے مورث الہی قدس سرہ العزیز کی سیرت پاک سے خوشہ چینی کی سعادت اس لئے حاصل کی کہ شاید اس کی دلائل ویز خوشبو سے یہ اوراق بھی مہک اٹھیں۔
حضرت امام شافعی علیہ الرحمۃ نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا تھا:

أَعِدُّوْكُمْ نَعْمَانَ لَنَا إِنَّ ذِكْرَهُ
هُوَ الْمُسَدُّ مَا كَرَّرْتَهُ يَتَصَنَّبُ

نعمان حضرت امام اعظم کا اسم گرامی (کا ذکر تکرار سے کرتے رہو
کیونکہ وہ تو کستوری کی مانند ہے۔ اس میں جس قدر تکرار ہوگا
اتنی ہی زیادہ خوشبو پھیلے گی؟

میں جب گرمی کی چٹھیاں گزار کر خوشاب پہنچا تو ہندو اور سکھ ہم جماعت عنقا
ہو چکے تھے اور ان کی جگہ وہ مسلمان طلباء لے چکے تھے جو ہجرت کی بے پناہ صعوبتیں تھیل کر
اور خون کی ہولی کا تماشا دیکھ کر اس نوزائیدہ مملکتِ خدا داد میں پہنچنے میں کامیاب
ہوئے تھے۔ بے شمار معصوم جانیں اس کی نقل مکانی کی نذر اور لاتعداد عصمتیں نذر برہمن

ہو چکی تھیں۔ دریاؤں کا پانی بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو ہو کر سمندر میں غرق ہو چکا تھا اور ہندو سکھوں کے زیرِ سایہ، خونِ مسلم کی اس ارزانی پُرستروں کے شادیاں بجا چکے تھے۔

تحریکِ پاکستان کے ایک مخلص اور درویشِ صفت کارکن جناب ایم۔ اے شیدا ایڈووکیٹ لاہور اپنی تصنیف ”توڑ دی زنجیریں“ میں ترتیبِ تاریخ آزادی کے ضمن میں قحطِ طراز ہیں:

”ایک طرف بے سرو سامانی، مسلمان پناہ گزینوں کی آپس اور کیمپوں کی بھوک و پیاس کی شدت سے بے حال بوڑھے بچے، نوجوان مرد و خواتین پر قیامت گزر رہی تھی اور دوسری طرف ہندوؤں کا غیر انسانی سلوک، ان کے زخموں پر نمک چھڑک رہا تھا۔ سہاگ لٹے، بچے چھنے، ماؤں کی ممتا پر قیامت ٹوٹی، بہنوں کی حسرتیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں، رشتے کٹے، ناطے ٹوٹے، بیوی سے خاوند جدا ہوا، باپ سے بیٹا بچھڑا، گھر بار اور مال و زر کی توخیر کہانی ہی کیا تھی؛“

مغربی پنجاب میں بھی فسادات کی آگ تو بھڑکی لیکن اس کی تپش اتنی قاتل اور بولناک نہیں تھی اور یہ ایک ردِ عمل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ خود ہمارے گاؤں میں جب غیر مسلموں کی بہیمیت کی داستاںیں پھیلنا شروع ہوئیں تو ہندوؤں اور سکھوں کے اندر عدمِ تحفظ کا احساس بہت بڑھ گیا۔ خاص طور پر جب گاؤں سے دودھ خریدنے والے دو سکھ قتل ہو گئے تو حالات نازک صورتِ حال اختیار کر گئے۔ ایک دن سارے ہندو سکھ منڈی کے

اندرا کھٹے ہوئے کہ فرداً فرداً مارے جانے کی بجائے یکبارگی قتل ہونا ہی بہتر ہے لیکن اس سے یہ ہوا کہ ان کے گھر کا سامان غیر محفوظ ہو گیا اور جس کے ہاتھ میں جو چیز آئی اُس نے اُٹھالی۔ فضل محمد عرف پھلانا چھی (شکاری) بھی لدرھے کے مکان سے چیزیں ڈھو، راتھا کہ گلی سے گزرتے ہوئے ایک خوبصورت چھوٹی سی بیٹری اُس نے اوپر میری طرف پھینک دی۔ والدِ محترم نے پوچھا یہ بیٹری کہاں سے لی ہے۔ میں نے ساری بات بتادی اُنہوں نے پھلو کو ہاتھ کے اشارے سے منع کیا تو وہ کمالِ سعادت مندی سے ساری چیزیں مع بیٹری واپس چھوڑ آیا۔ اس کے بعد گاؤں کے تمام ہندو مسلمان، ہو گئے۔ صحنِ مسجدِ اعلیٰ حضرت میں ایک شامیانے کے نیچے بعد از نمازِ ظہر مولانا سیف الرحمن صاحب نے ایک پُرہنہ تقریر کی اور لا اکر اء فی الدین کی تفسیر بیان فرمائی۔ والدِ محترم نے بعض مسلمانوں کو دعوتِ طعام پر مدعو کیا۔ شیش محل میں یہ دعوت دی گئی تھی۔ ہندوؤں کو پلاؤ کھاتے میں نے وہاں پہلی اور غالباً آخری مرتبہ دیکھا۔ پھر اچانک یہ لوگ ایک سیشل ٹرین میں سوار ہو کر سندھ تان سدھار گئے۔

تقسیمِ برصغیر کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول نوشاب کا ماحول یکسر بدل گیا تھا۔ نئے اساتذہ جو ”سہاجرین“ بن کر آئے ان میں حساب کے ٹیچر جناب عبدالسلام نہایت ہی شہساز و قابل اور ذہینا پکے مسلمان تھے۔ طلباء میں بھی اب جذبہٴ حب الوطنی واضح طور پر بیدار ہو چکا تھا کیونکہ قائدِ اعظم واقعی ایک عظیم اور محبوب رہنما کے روپ میں ہمارے دل و دماغ پر چھا چکے تھے۔ ترکِ وطن کر کے یہاں پہنچنے والے اصحابِ سبحان اللہ روشنی کے چلتے پھرتے مینار تھے۔ اُنہوں نے یہاں پہنچتے ہی اس ملک کو دل سے اپنا وطن سمجھ لیا بلکہ اسی وطن کی تلاش میں ہی تو ایک صبح وہ مال گاڑی پر خوشاب ریلوے اسٹیشن پر اترے تھے۔

انہوں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے کسی مہلت یا موقع کا انتظار نہ کیا بلکہ متروکہ دکانیں اس طرح سنواریں اور ریڑھیاں اس طرح سجائیں کہ لطف آگیا۔ بازار میں بڑی رونق اور چہل پہل رہنے لگی۔ ان لوگوں کے آنے سے مساجد کی رونقیں بھی دوبالا ہو گئیں اور ہم نے جب ماحول میں مسلمان ہی مسلمان دیکھے تو قائدِ عظیم کا قد کاٹھ ہماری نگاہوں میں عظیم تر ہو گیا۔ خوشاب کے بازار کلاں کی جامع مسجد تقسیم ملک سے پہلے نمازِ جمعہ میں نصف صحن تک بمشکل بھری جاتی تھی جبکہ اب وہاں تل و دھرنے کو جگہ نہ ملتی۔ چنانچہ گرمی کی چٹیاں گزار کر جب پہلی مرتبہ میں اس مسجد میں نمازِ جمعہ کے لئے گیا تو صحنِ مسجد کو کھپا کھپا بھرا دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ اسی روز میں ابھی صدر دروازہ کی ڈیورھی ہی میں تھا کہ ایک نہایت خوش الحان مولانا کو خطاب فرماتے سنا جو نہایت تھے موضوع سخن حصولِ پاکستان کی تاریخ ساز جدوجہد اور اسلامیانِ ہند پر توڑے جانے والے انسانیت سوز مظالم تھے۔ ڈیورھی کے اندر ہی میں نے سنا کہ مولانا بیٹری والے لاؤڈ سپیکر پر بڑے پرتاثر لہجہ میں کسی شعر کا دوسرا مصرع پڑھ رہے تھے:

کہ جب پہلی کرن پھوٹی تو پر وانوں پہ کیا گزری

میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اب میں ان کی طرف نظر جمائے اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ مولانا ایسا قیمتی شعر کئی مرتبہ دہرائیں گے تو پہلا مصرع یاد کر لوں گا۔ لیکن شاید اس زمانے میں علمائے کرام کا علم سے لا تعلق ہونا ضروری نہ تھا وہ اپنے سلسلہ کلام میں ایسے آگے نکلے کہ دوبارہ واپس نہ آسکے۔ یہاں تک کہ نماز کھڑی ہو گئی اور میں پہلا مصرع سننے کی حسرت ہی لے کر واپس لوٹ آیا۔ اس دن سے لے کر ایک طویل عرصہ تک میں اس مصرع کے کھوج میں رہا۔ ساحر لدھیانوی کی ایک خوبصورت غزل اسی

قلیہ وردیف میں تھی لیکن اس میں یہ شعر موجود نہ تھا نتیجتاً ایک خاموش حسرت اندر ہی اندر دبی رہی۔

چنانچہ ۱۹۷۳ء کی ایک مدہم اور یاس آفریں صبح تھی۔ چوہدری محمد صبا ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی ایڈووکیٹ جو پولیس میں میرے رفیقِ کار رہ چکے تھے میرے گودھال میں میرے پاس دفتر میں تشریف لائے۔ معمول یہ تھا کہ چوہدری صاحب سے گفتگو شاعری کے دلچسپ موضوع سے شروع ہوتی اور درمیان میں کچھ ہیکلی اور بے رس کاروباری گفتگو کے بعد پھر اسی نکتہ آغاز پر ختم ہوتی۔ اُس روز میں نے اُن سے اپنی متذکرہ بالاسرت کا ذکر کر دیا۔ میں دیر تک سکوتِ حیرت میں ان کا منہ دیکھتا رہا جب انہوں نے پڑھا۔

نہ شمعِ انجمن سمجھی نہ اہلِ انجمن سمجھے

کہ جب پہلی کرن پھوٹی تو پروانوں پہ کیا گزری

حافظ محمد صدیقی صاحب نے میرے ہم جماعت اور ہم محلہ تھے۔ ہم اکثر ایک ہی جگہ کورس کی کتابیں پڑھتے۔ سید فضل حسین، طاہر حسین، ملک شیر محمد، عطار رسول، غلام رسول، طاہر شاہ اور محمد سرفراز ایسے ہم جماعت تھے جو کسی نہ کسی خاصیت کی بنا پر اس تک حافظہ میں محفوظ ہیں۔

۱۱ ستمبر ۱۹۳۸ء کا دن بڑا ہی حسرت ناک تھا۔ حضرت قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ حضرت بابائے قوم کی اس بے وقت موت نے پوری قوم پر غموں کے پہاڑ گرا دیئے۔ ہر کس و ناکس دیوانہ وار آنسو بہا رہا تھا ہاں نو عمر مملکتِ خداداد کی کشتی کا کھیون مار کشتی کو عین منجدھار میں چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا تھا۔ ہمارے اُستاد جناب عبدالسلام صاحب نے سوگوار طلباء کا ایک

جلوس ترتیب دیا۔ ہم کمال نظم و ضبط کے ساتھ سکول سے نکلے اور غربی دروازہ سے بازار کلاں میں داخل ہو کر مشرقی دروازہ کے پاس جا کر رُک گئے۔ جناب عبدالسلام صاحب نے اس اجتماع سے خطاب کیا وہ بڑے فاضل اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے لیکن دوران تقریر کئی مرتبہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ میں یہاں سے اکیلا گھر لوٹا۔ چپ چاپ اور فرط غم سے نڈھال۔ سہنگل کے یہ بول بار بار زبان پر آجاتے۔

ہم جی کے کیا کریں گے

جب دل ہی ٹوٹ گیا

خوشاب سے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت قائد اعظم علیہ الرحمہ کے انتقال پر والد محترم نے اپنی تمام گزشتہ زندگی کے معمولات کے برعکس مسجد کے اندر سو گوار لوگوں کے اجتماع سے محترم خطاب فرمایا۔ یہ بات ان کے حوالے سے اتنی عجیب تھی کہ مجھے بطور خاص اس تقریر کے بارہ میں بتایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ واقعی ان کی طبیعت بڑی ادا اس اور کھوٹی سی تھی زیادہ دیر حضرت قائد اعظم کی وفات سے پیدا ہونے والی صورت حال سے متعلق ہی باتیں کہتے رہے۔ ان دنوں انہوں نے نظر کی عینک استعمال کرنا شروع کر دی تھی۔ باریک اور خوبصورت فریم میں شفاف چشمے مطالعہ کے لئے استعمال کرتے۔ شوکت تھانوی کی ہلکی تحریریں پسند تھیں۔ کبھی کبھار دیوان حافظ، بھی پڑھتے اور بعض غزلیں تو بار بار دہرتے جن میں چند ابتدائی غزلیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں نے انہیں کئی بار امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی کہ یہ غزل گنگنائے سنا

غیرم رسیدام شب کہ نگار خواہی آمد

مسرمن فدائے راپے کہ سوار خواہی آمد

ہمہ آہوانِ صحرائے خود نہادہ بر کف
 یہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد
 کششے کہ عشق دارد نگذاردت بدیساں
 یہ جنازہ گر نیائی یہ مستزار خواہی آمد

ان کی آواز کا ترجمہ بھی بڑا پر کیف ہوتا البتہ اس قسم کی گنگناہٹ بڑی نایاب چیز
 تھی۔ جمعہ کے روز منظوم خطبہ البتہ عام شکر کائے نماز کے سامنے پڑھتے۔ کوئی اجنبی اگر شامل
 نماز ہوتا تو منہ ہی تکتا رہ جاتا۔ ۱۹۴۷ء کے رمضان المبارک میں جمعۃ الوداع کا خطبہ بمقام سرگی
 انہوں نے خیمہ کے اندر پڑھا۔ یہ خیمہ رہائشی مکانوں سے بجانب جنوب منتقل ہی نصب
 تھا۔ حضرت سید قسوری دایم الحضور ہی قدس سرہ العزیز کا لکھا ہوا خطبہ تھا:
 حَمْدُ اللّٰهِ حَمْدًا لَّا فَنَاءَ۔

اس اجتماع میں اتفاقاً ایک مسافر مولوی صاحب بھی گزرتے ہوئے شامل ہو گئے
 تھے کہ نماز جمعہ کا ثواب مفت میں مل رہا تھا۔ وہ پورے خطبہ کے دوران منہ کھولے انہیں
 تکتے ہی رہے۔ ان کے انتقال کے بعد جب بھی کبھی یہ منظوم خطبے پڑھے جاتے تو حاضرین میں اکثر
 رقیق القلب لوگ رو پڑتے۔ صوبیدار لعل خان صاحب تو کافی عرصہ بعد بھی ان خطبوں کو
 سنتے ہی زار و قطار رونا شروع کر دیتے۔

دگر دانائے راز آید کہ ناپید

ان کی حیات مستعار کا آخری موسم سرمایہ سازی یا دوستوں کا ناقابلِ فراموش سرمایہ ہے۔ بنگلہ کے جنوب کی طرف دروں کے کھلے چھت پر تنہا ایک کرسی پر بیٹھ جاتے اور سینک لگا کر دیوانِ حافظ کا مطالعہ پورے انہماک سے کرتے رہتے۔ خوشاب سے جب بھی میں گھر آتا تو نہ معلوم کیوں چھپ کر انہیں دیکھتا رہتا۔ لطف کی بات یہ کہ اس منظر سے کبھی جی نہ بھرتا اور: ط

بجزیں نماں دانا ہو سے و آرزوئے

حتی کہ وہ دن بھی آگیا جب یہ منظر آسمان کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہو گیا۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی طبیعت میں وہ اٹھان باقی نہیں رہی وہ اکثر خاموش اور مجھے بوجھ سے رہنے لگے تھے۔ اندر ہی اندر تو یہ مرض دو چار ماہ سے شروع تھا لیکن غالباً گروہ کی یہ تکلیف اب واضح صورت اختیار کر رہی تھی۔ گاؤں کی سول ڈسپنسری کے کپاؤنڈر جو ڈاکٹر نہ ہونے کے باعث ڈاکٹر ہی کے نام سے معروف تھے ہر رشتہ ان کے پاس آتے اور اپنی فیس کھری کر کے چلے جاتے لیکن افاقہ کے نام کی کوئی چیز ظاہر نہ ہوتی تھی۔ نقاہت بھی اب روز افزوں تھی۔ یہاں تک کہ وہ کاروبار زندگی سے عملاً دست کش ہو گئے۔

انہی دنوں اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیزہ کا مدرس مبارک تھا۔ ۲۱ جنوری ۱۹۴۹ء کو

۲۱ ربیع الاول ۱۳۴۸ ہجری بھی تھی۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ نقاہت اور کمزوری کی بناء پر بظاہر

توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ مسجد میں تشریف لائیں گے۔ خلاف توقع اٹھے وضو کیا

و شیش محل سے اگلی نشست گاہ میں سے نکل کر مسجد کے غریب دروازہ سے داخل ہوئے۔

۲۱ ستمبر پر جلوہ افروز ہو گئے۔ یہ ان کی زندگی کا آخری خطبہ تھا۔ عجیب اتفاق یہ کہ اس

یہ قتل حضرت پیر قصوری قدس سرہ العزیزہ کے یہ منظوم خطبے انہوں نے بہت ہی کم

پڑھے تھے۔ ان نظموں کے چند اشعار تیسرا درج کرنا مناسب ہوگا۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي جَعَلَ الْوُجُودَ مِنَ الْعَدَمِ

وَالشُّكْرُ لِلَّهِ الَّذِي بِيَدِيهِ الْأَنْوَاعُ وَالنَّعَمُ

هُوَ فَالِقُ هُوَ رَازِقُ هُوَ فَاتِحُ هُوَ فَالِقُ

هُوَ فِي الْمَوَاعِدِ صَادِقُ قِيصَانُهُ أَعْلَى الْأَعْمَامِ

پھر فارسی میں یہ نظم پڑھی :

خوشنود گر خواہی خدا در شرع شو ثابت قدم

در نہی او اندر میا۔ و از امر او بیرون مرم

عزت از ذلت از و صحت از و علت از و

از وے مگر دانی تو رو۔ گر سازد تستی چون قلم

دنیاست یارے بے وفا با کس نہ سازد واکما

این دفتر پر ما جزا۔ حرف فنا دارد رقم

”دنیا دوست تو ہے لیکن وفا دار نہیں۔ یہ کسی سے مستقلاً نباہ کرنا

نہیں جانتی۔ اس کے تمام گزبے ہوئے واقعات پر حرفِ فنا

کی چھاپ ثبت ہے۔“

انہری شعرا نہوں نے مکرر پڑھا۔ یہ اتنا حسبِ حال تھا کہ کچھ پڑھتے بزرگوں کی آپس
سسیوں میں بدل گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے عام ملاقاتوں کا سلسلہ بند کر دیا اور
اب وہ شیش محل سے اوپر بنگلہ میں منتقل ہو گئے تاکہ اہل خانہ بھی تیمارداری میں شریک
ہو سکیں۔ ان دنوں خوشاب میں ایک ریوے ڈاکٹر کی قابلیت کا شہرہ تھا۔ مولانا محمد معصوم
صاحب سے کہا گیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آئیں۔ پیغام کچھ ایسا تھا کہ میں بھی ساتھ چل
پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے جب والدِ محترم سے حوصلہ افزا گفتگو کی تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ مصیبت
اللہ کے فضل و کرم سے بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے صبح ہی صبح
جبکہ وہ بنگلہ میں مشرقی دیوار کے ساتھ بجانب جنوب بیٹھے تھے، پیٹ کے اندر ایک آلہ سا
چھویا۔ میری حیرانی کی انتہا کہ ان کے چہرے پر کوئی ناخوشگوار تاثر ظاہر نہ ہوا البتہ میرے لئے یہ
مشاہدہ ناقابلِ برداشت حد تک اذیت ناک تھا گھبراہٹ میں میں نے اللہ سے دعا کی کہ
”یا میرے پروردگار یہ مصیبت ان سے ٹل کر میری طرف منتقل ہو جائے لیکن“

ایں سعادت قسمتِ شاہساز نوشا ہیں کردہ اند

جب اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اس ترکیبِ علاج
کو ترک کر دیا اور خوشاب جا کر کھانے والی ادویہ بھیجے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ڈاکٹر صاحب
کے اس طرح نام کام لوٹنے سے حالات کے گھمبیر ہونے کا احساس اور زیادہ شدید ہو گیا۔
میٹرک کے امتحان میں اگرچہ چند ہفتے باقی تھے لیکن مجھے واپس جانے کی ہمت نہ ہوئی اور
میں نے خوشاب جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں ان کے قرب و جوار ہی میں رہتا اس لئے کہ

دُور جانا میرے توہمات اور ناویدہ حدیثات میں اضافہ کر دیتا۔ ایک دن بعد دوپہر جبکہ
 جبکہ سورج بادلوں میں گم اور فضا بڑی منگھوم تھی مجھے فرمایا کہ پیٹ پر زور کی مالش کرو۔
 اُس وقت وہ چمڑے کے پتنگ پر شمالی دیوار کے قریب لیٹے ہوئے تھے۔ یہ خدمت کا
 ایک نادر موقع تھا۔ میں نے غالباً باوام روغن سے مالش شروع کر دی اور پورے زور سے
 مالش کرتا رہا تھوڑی دیر کے بعد تھکن کے باعث زور میں کمی آگئی۔ اُنہوں نے فرمایا
 ”اور زور سے“ میں پہلے ہی تقریباً نڈھال ہو چکا تھا۔ گھبرایا کہ اب کیا ہوگا۔ اسی گھبراہٹ
 میں میں نے از سر نو زور لگانا شروع کیا پھر مجھے دیر تک یہاں تک کہ مالش کے اختتام
 تک کسی تھکاوٹ کا احساس نہ ہوا اور نہ ہی قوت میں کوئی کمی واقع ہوئی۔

انہی دنوں علالت کی شدت میں مزید اضافہ کی خبر سن کر نانا جان حضرت
 مفتی عطا محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو عرس مبارک کی تقریب سے فارغ ہو کر واپس چلائے
 تھے دوبارہ تشریف لائے۔ اب جو بزرگ حالات کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے بالکل سنجیدہ اور
 متشوش تھے اور اُن کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی ہوئی صاف نظر آرہی تھیں۔ بار بار سر جھرتے
 اور مختلف تجاویز کے متنوع پہلوؤں پر غور کرتے۔ سب کی تجویز یہ تھی کہ حضرت صاحب
 کو میوہ ہسپتال لاہور لے جایا جائے لیکن اس میں بقول حضرت مفتی صاحب ”صاحبِ قرآن“
 کی رضامندی شرطِ اول تھی۔ بالآخر والدہ ماجدہ رحمۃ اللہ علیہا کے اصرار پر اُنہوں نے
 رضامندی کا اظہار کر دیا۔

میں صرف چند دن ہی بیشتر خوشاب لوٹ چکا تھا۔ خوشاب میں یہ خبر سنی تو
 طبیعت ٹھیک نہ رہی۔ عیسیٰ آوازوں کی سرسراہٹ سمجھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ صبح
 ختم ہوئے دن اُس ڈالی کے جس پر تیرا بسیرا تھا

بجلیت تمام خوشاب لوٹ آنے کی حماقت پر بڑی ندامت ہوئی۔ دنیاوی دھندے

اور زندگی کے کاروبار انسان کی وفا شعاری پر اگر شاندار ہو جائیں تو اس سے بڑا ظلم اور

کیا ہوگا۔ امتحان کے لئے پڑھائی ناگزیر تھی لیکن : ص

کس کام یہ دُنیا آئے گی جب عمر رواں ہی بیت گئی

میں رات کو سو نہ سکا۔ گاڑی اُن دنوں صبح سب سے پہلے خوشاب سے چل کر بوقت سحر لڈ

ریلوے اسٹیشن پہنچتی تھی۔ جب میں لڈ ریلوے اسٹیشن پہنچا تو وہاں کی ہر چیز دگر یہ شبہم،

سے شراہور تھی۔ لاہور کے لئے معلوم نہیں میرا ساتھ کس نے دیا۔ بہر حال غالباً اُسی شام

میں لاہور پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ میوہ ہسپتال کے فمیلی وارڈ کمرہ نمبر ۱۶ میں آپ کو رکھا گیا ہے۔

ساتھ ملحقہ کمرہ میں والدہ ماجدہ مع سجادہ ٹوٹھل مقیم تھے۔ دورانِ سفر میں نے کئی عجیب و غریب

تصویرات بھی قائم کر لئے تھے کہ جب میں کمرہ کے اندر جاؤں گا تو تمام تر شدتِ مرض کے

باوصف میری طرف دیکھ کر مسکرا دیں گے اور میں طمانیتِ قلب کی دولت سے مالا مال ان

کے پاس بیٹھ جاؤں گا۔ میں شام سے تھوڑی دیر پہلے ہسپتال پہنچ گیا اور دھڑکتے دل سے دروازہ

کھول کر اندر گیا تو وہ پتنگ پر دائیں طرف پانسہ پلٹ کر گہری نیند سو رہے تھے۔ سانس

بالکل معمول کے مطابق چل رہی تھی معلوم ہوا کہ یہ نیند نہیں بے ہوشی ہے اور آپ گزشتہ

روز سے اسی حالت میں لیٹے ہوئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں کے ایکسپینل نے اپنی

طرف سے ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن ان کے خیال میں مرض ایسے مرحلہ میں داخل ہو چکا ہے کہ

اب اس پر کنٹرول کے امکانات بہت کم ہیں۔ میں یہ سب کچھ سننا رہا مگر کچھ بولنے کی ہمت

نہ ہوئی میں ہسپتال کے درو دیار پر لکھی ہوئی تحریر ہے:

”سر آمد روزگارے این فقیرے“

پڑھتا تھا۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی مکمل بے بسی اور بے چارگی کا احساس ہوا۔ میں علیحدگی میں سر پکڑ کر ایسے بیچھڑ گیا گویا اب مزید زندہ رہنے کی خواہش باقی نہ رہی ہو۔

رات بسر کرنے کے لئے میں قاری عبید اللہ صاحب کے ہمراہ جناب ماموں عبدالقدوس صاحب ہاشمی کی رہائش گاہ ۳۳ ننگمری پارک چلا گیا۔ جناب ممدوح نے نمک ہندوستان بھیجنے کا کاروبار زینا نیا شروع کیا تھا۔ علی الصبح پروگرام یہ سنا کہ میں اور قاری عبید اللہ صاحب والدہ ماجدہ کے ہمراہ واپس لوٹ رہے ہیں۔ تیار ہو کر باہر آئے۔ ہم میوہ ہسپتال کے گیٹ جو نسبت روڈ کی طرف کھلتا ہے، کے قریب پہنچے تو میں نے چچا جان سے درخواست کی ایک مرتبہ مجھے واپس جانے کی اجازت دیں۔ یہ اگر چہ بے وقوفانہ حرکت تھی تاہم چچا جان نے کوئی تعرض نہ فرمایا۔ میں دوڑ کر واپس آیا اور زندگی میں آخری بار اُن کو دیکھنے کی غرض سے دروازہ کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور یہیں کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑے ہی خوبصورت انسان تھے اور بڑے ہی ذی وقار۔ ایسی تکلیف دہ اور جان لیوا طویل مرض کی پوری شدت میں کسی انسان نے ان کے چہرے کی ہنسی کو بدلتے نہ دیکھا، ناگواری کی رمت تک اُن کے چہرے سے عیاں نہ ہوئی نہ کسی نے رہائے، سنی اور نہ ہی کوئی حرفِ شکر اُتتا۔ وہ اپنے تمام تر حُسن و جمال اور وقار و تمکنت کے ساتھ مکمل سکون سے لیٹے گہرے سانس لے رہے تھے۔ کاش زندگی اتنی مستعار نہ ہوتی۔ آج یعنی ۱۲ فروری کو ان کا یومِ پیدائش بھی تھا اور آج ہی ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو وہ اپنی زندگی کے تینتالیس سال پورے کر رہے تھے۔

سحرے گفت بلبل باغباں را
دریں گل جنبہ نہالِ غم نگیرد

یہ پیری مے زرد خارِ سیاہاں

وے گل چوں جواں گرد و بمیرد

”ایک صبح بلبل بانہاں سے یہ شکوہ کر رہی تھی کہ دنیا کے اندر پھول

کی قسمت میں صرف غم اٹھانا ہی لکھا ہے۔ (یہ کیا بات ہوئی کہ)

جنگل میں اُگنے والا کاٹا تو بڑھاپے کی منزلیں طے کرے اور

پھول کھلنے کے ساتھ ہی مڑ جھاجائے؟“

اُس دن کا سفر بہت بے کیف تھا۔ لالہ موسیٰ پلیٹ فارم پر میں ادھر ادھر

بے مقصد عکس لگا کر ملکوال کے لئے گاڑی روانہ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ یہ سفر طویل تر محسوس

ہوا۔ اللہ گاؤں کے بالمقابل گاڑی رُک گئی۔ یہ ڈرائیور کی مہربانی تھی عورتوں کے ہجوم میں

بے ہنگم آہ و بکا سے طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ قاری صاحب اور محمد صیغۃ اللہ صاحب

میں ہمراہ تھے۔ دوسرا دن خاموشی سے گزر گیا۔ تیسرے یعنی ۱۳ فروری کو تو ہم نے اس

امکان پر بھی غور کیا کہ شاید کسی معالج کی کوئی تدبیر کارگر ثابت ہو گئی ہو اسی گوگلو میں شام

ہو گئی۔ ہم سب سہمے ہوئے اوپر بنگلہ میں یکجا تھے۔ حاجی میاں محمد مرزا صاحب اور جناب

میاں محمد حسن صاحب مغفور والد ماجد جناب محمد زاہد چشتی بھی ہمارے پاس موجود تھے۔ کسی نے

صدا دی کہ ”تارا آیا ہے“ اچانک سب دم بخود ہو گئے۔ کسی میں بھی حقیقت کا سامنا کرنے کی

ہمت نہ تھی۔ صاحبزادہ عبدالرشید صاحب نے اٹھ کر تارا لیمپ کے قریب کر کے کھول دیا

فناہ یا بادۂ ہر جام کردند

چہ بے دردانہ او یا عام کردند

تماشہ گاہ "نختم آشیاں" را

جہان ماہ و انجم نام کردند

حاجی میاں مرزا صاحب تھوڑی دیر تو خاموش رہے پھر اچانک مشرقی دروازہ سے نکل کر دوڑ پڑے اور ایک دلدوز پیچ کے ساتھ سیر پھریاں اتر گئے۔ اطلاع کے مطابق علی الصبح خوشاب کے راستہ آپ کو لایا جا رہا تھا۔ اللہ پلٹ فارم مکمل چاند کی اداس روشنی کے اندر سکونِ حیرت میں غرق تھا۔ گاڑی ریلوے اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی تو صبر و تحمل نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ چوب صندوق میں آپ کو رکھا گیا تھا۔ گھر پہنچے تو شیش محل کے سامنے صحن میں آپ کو رکھ دیا گیا۔ باپردہ خواتین زیارت کر چکیں تو عام مستورات کے لئے جگہ بہت تنگ ہو گئی۔ صندوق پہرینگلہ میں منتقل کر دیا گیا لیکن عجیب بات یہ کہ یہ وسیع اور فراخ میدان بھی جیسے سُکڑ گیا ہو۔ آپ کے وجود مبارک پر پھولوں کا ایک خوبصورت لار رکھا تھا جو حرکتِ قلب اور اُس کی تھر تھراہٹ سے ایک طرف گرجتا دراصل اسی "حرکتِ قلب" کا تسلسل ہی میر ہسپتال کے ڈاکٹروں بالخصوص ڈاکٹر ریاض قدیر کے لئے عجیب و غریب پریشانی کا باعث بن چکا تھا۔ حقیقت میں موت ایک دن پہلے ہی واقع ہو چکی تھی لیکن ڈاکٹروں کی جماعت تمام نشانیوں موجود پا کر بھی اسے موت قرار دینے سے متردد تھی۔ معالجین کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا کہ انسان پر مکمل موت بھی طاری ہو چکی ہو لیکن اُس کا دل معمول کے مطابق حرکت بھی کر رہا ہو۔ میں اس بے سنگم پھیڑ کو چیرا صندوق کے سر لانے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دل کے مخصوص مقام پر دل کی دھڑکن جیسی حرکت مسلسل ہو رہی تھی اور سینے پر سے پھول بار بار آہستہ آہستہ سرکتے سرکتے نیچے گر جاتے۔ ماتھے پر برق سفید سے ملتی چلتی چمکدار لکیریں تھیں۔ عام نظر میں بالکل پسینہ سے مشابہ لیکن ہاتھ لگانے سے

ان پر کوئی فرق نہ پڑتا۔

یہ دو شواہد ایسے ہیں کہ ہزار ہا انسانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اگر
میں خود ان کا مشاہدہ نہ کرتا تو انہیں تسلیم کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی۔
لوگوں کے کثیر اجتماع کے پیش نظر طے یہ پایا کہ روایتی جنازہ گاہ جو مسجد خاندانہ شریف
سے شمال مغرب میں قبرستان سے ملحقہ تھی بالکل ناکافی ہوگی۔ لہذا جنازہ ہماری زرعی زمین
سے متصل ایک وسیع و عریض میدان الموسوم ”رمضان والے پڑے“ میں ادا کیا جائے۔
چنانچہ بعد دوپہر صندوق جب اٹھایا گیا تو مزید کھرام مچا اور بڑی دردناک تمنیں بلند
ہوئیں۔ بنگلہ سے ”رمضان والے پڑے“ تک مخلوقِ خدا بکھری پڑی تھی۔ لمبی لمبی تیرہ کے
قریب قطاریں ترتیب دی گئیں اور ایک اندازہ کے مطابق فی صنف کم سے کم پانچ چھ سو
نفوس تھے۔

حضرت عم محترم کی فرمائش پر نمازِ جنازہ حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب نقشبندی
مجددی سجادہ نشین میر علی شریف (سرگودھا) کی اقتداء میں ادا ہوئی۔ نمازِ جنازہ سے
فراغت کے بعد جناب مولوی سیف الدین ازہم نے حاضرین سے مخاطب ہو کر
یہ تجویز پیش کی کہ حضرت صاحب کے بڑے صاحبزادے صاحبزادہ محمد مطلوب الرسول
صاحب کی دستار بندی اسی موقع پر کرادی جائے۔ الحاج چوہدری احمد خان صاحب
لہ شریف اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تائید فرمائی بلکہ تمام حاضرین
نے اس تجویز کو مستحسن قرار دیا۔ جناب عم محترم، جناب مفتی صاحب اور جناب صاحبزادہ
محمد عمر صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس کی ابتداء کی اور باقی بزرگان نے
تبرکات اس میں شمولیت کی۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کی پائیں جانب لحد تیار ہو چکی تھی۔ واپس مسجد
خالقاہ شریف پہنچے تو صحن مسجد میں فقیر کرم دین پر عجیب و غریب عالم طاری تھا۔ اُس
نے تدفین میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ دنیا و مافیہا سے بے نیازنگے سر کو مکھرے ہوئے لمبے بالوں
کے ساتھ اُوپر اٹھاتا اور آسمان کی طرف دیکھ کر پھر گھٹنوں تک نیچے لے جاتا اس عمل مسلسل
میں وہ گرد و پیش سے بالکل لاتعلق تھا۔ آنکھیں سُرخ اور متورم اور سُبحان اللہ سبحان اللہ
کی گردان میں بھونے خون، ان سے جاری و ساری۔

غلام جیلانی مستری اُن حضرات میں شامل تھا جنہوں نے صندوق کو لحد میں رکھا اُس
نے اُن کے پیرے سے لمحہ بھر کے لئے بھی نظر نہیں ہٹائی۔ خالقاہ شریف کے اندر یہ واحد
آدمی تھا جس کے جذبات اُس کے قابو سے باہر تھے۔ وہ زور کر بلکان ہو رہا تھا اور لوگوں
سے کہتا:

”دیکھو میرے پیر کو دفن کر رہے ہیں۔ اب زندگی بھر ان کو نہیں
دیکھ سکوں گا۔“

ایک دُنیا ڈوبتے سورج کو وقتِ شام دیکھ رہی تھی۔ تدفین کے مراحل طحہ بر لمحہ اپنے
منعلق انجام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں میں جلال و جمال کا ایک پیکر حسین مٹی کی ایک
خاموش ڈھیری کی شکل اختیار کر گیا اور کمال یہ کہ اسکے ساتھ ہی بڑی بڑی اُمیدیں خوبصورت
آرزوئیں اور حسین تمنائیں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔

اُڑتے اُڑتے اُس کا بچھی دُور اُفق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سوداٹی کی

